ہندوستان کی آبادی

محمد ابوذر

ہندوستان کی آبادی

محمد ابوذر

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

پیش لفظ

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم و ثقافت کے تحت ترقی اردو بیورو کے ذریعے جن لائحوں اور منصوبوں کو عملی شکل دی جا رہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جدید علوم پر کتابیں ماہرین سے لکھوائی جائیں اور ان علوم سے متعلق اہم مغربی و مشرقی کتابوں کے تراجم شائع کیے جائیں جو نہ صرف زبان بلکہ قوم کی ترقی میں بھی مفید و معاون ثابت ہوں۔

اس منصوبے کے تحت ترقی اردو بیورو اب تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں شعر و ادب، تنقید، لسانیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، تجارت، زراعت، امور حکومت، معاشیات، عمرانیات، قانون، طب، فلسفہ اور نفسیات پر اعلیٰ کتابوں کے علاوہ تعلیم بالغان، بچوں کے ادب، سائنس اور تکنیکی علوم سے متعلق ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اردو کی نصابی ضرورتوں کو بھی کسی حد تک پورا کر رہی ہیں۔ ان موضوعات پر اچھی آسان اور معیاری کتابوں کی جو کمی اردو حلقوں میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی وہ بیورو کے ذریعہ آہستہ آہستہ پوری ہو رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتابیں حسنِ طباعت کا ایک معیار قائم کرتی ہیں اور ان کی قیمت بھی نسبتاً کم رکھی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بیورو کے جامع منصوبوں کے تحت اردو انسائیکلوپیڈیا، اردو لغت (کلاں) اردو لغت (برائے طلبہ) انگریزی اردو لغت، اردو انگریزی لغت، بنیادی متون کی اشاعت، اردو کتابیات کی تیاری اور مختلف علوم کی اصطلاح سازی کے کام بھی جاری ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ہمیں ملک بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ترقی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کا ایک جز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کے۔ کے کھلر

ڈائریکٹر، ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی

فہرست

باب 1

ابتدائیہ

ہندوستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے، اگرچہ رقبے کے اعتبار سے اس کا مقام ساتواں ہے۔ اس ملک کی کل آبادی تقریباً 61 کروڑ اور کل رقبہ تقریباً 32 لاکھ 87 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اگرچہ مدھیہ پردیش رقبے کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے تاہم صوبوں میں اتر پردیش کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ براعظم ایشیا کے جنوب وسط میں واقع اس ملک کے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سلسلہ ہے جس سے چین اور نیپال کی سرحدیں ملتی ہیں۔ پہاڑوں کے چند متوازی سلسلے مشرق میں ہندوستان کو برما سے علیحدہ کرتے ہیں۔ مشرق میں ہی بنگلہ دیش بھی واقع ہے جس کی سرحدیں مغربی بنگال، آسام، میگھالیہ اور تری پورا سے ملتی ہیں۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں افغانستان اور پاکستان واقع ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحر عرب ہیں۔ جنوب میں خلیج منار اور آبنائے پاک ہندوستان کو سری لنکا سے علیحدہ کرتی ہیں۔ خلیج بنگال میں واقع جزائر انڈمان اور نکوبار اور عرب میں واقع لکش دیپ بھی ہندوستان کا حصہ ہیں۔

طبعی اعتبار سے ہندوستان کے تین بڑے حصے کیے جا سکتے ہیں۔ (1) شمالی پہاڑی علاقہ۔ (2) گنگا کا بڑا میدان۔ اور (3) جزیرہ نمائے دکن۔ شمال میں کوہ ہمالیہ ارضیاتی اعتبار سے نسبتاً نئے پہاڑ ہیں۔ یہ 2400 کلومیٹر کی لمبائی میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک لمبا چوڑا میدانی علاقہ ہے جس میں گنگا کے علاوہ بہت سے دریا بہتے ہیں۔ یہ میدان انہی دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بنا ہے۔ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی اسی ہموار میدان میں بستی ہے۔ جہاں تک جنوبی ہندوستان کا تعلق ہے یہ قدیم ترین چٹانوں سے بنا ہے۔ یہ چٹانیں معدنیات کا خزانہ ہیں۔ جزیرہ نمائے دکن کے مشرق اور مغرب میں ساحلی علاقے ہیں جو مشرقی اور مغربی گھاٹوں سے متصل ہیں۔ یہ ساحلی علاقے تنگ ہموار میدان ہیں۔

ہندوستان کی آب و ہوا گرم سیر مانسونی قسم کی ہے ۔ یہاں چار موسم ہوتے ہیں ۔ (1) موسم سرما، دسمبر سے فروری تک ۔ (2) موسم گرما، مارچ سے مئی تک ۔ (3) موسم باراں، جون سے ستمبر تک ۔ موسم باراں میں جنوب مغربی مانسونی ہواؤں سے بارش ہوتی ہے ۔ (4) شمال مشرقی مانسون کا موسم، اکتوبر سے نومبر تک ۔ موخرالذکر موسم میں زیادہ تر جنوب مشرقی ہندوستان میں بارش ہوتی ہے ۔ دراصل بارش کی تقسیم ہندوستان میں انتہائی غیر ہموار ہے ۔ مشرقی اور شمال علاقہ میں زیادہ بارش (اوسطاً سالانہ بارش 2000 ملی میٹر) ہوتی ہے اور شمال مغرب میں بارش بہت ہی کم (اوسطاً 100 سے 500 ملی میٹر تک) ہوتی ہے ۔

ہندوستان کے باشندوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور رہن سہن میں علاقائی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ یہاں گورے کالے سبھی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ ان کے قد، بالوں کی ماہیت اور آنکھوں کے رنگوں میں بھی اختلافات نظر آتے ہیں ۔ ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان تاریخی دور کے شروع سے ہی مختلف نسلوں کی آماجگاہ رہا ہے ۔ ہندوستان کے ابتدائی باشندے رنگ میں کالے، قد میں چھوٹے اور چوڑی ناک والے تھے ۔ ہند آریائی لوگ، سانولے، لمبی ناک والے اور لمبے تڑنگے تھے ۔ ابتدائی باشندے دراوڑ زبان بولتے تھے جب کہ ہند آریائی لوگوں کی زبان ہند یوربی تھی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دونوں نسلیں آپس میں بہت کچھ گھل مل گئیں اور وقتاً فوقتاً اس مرکب میں دوسری نسلوں کے لوگ بھی شامل ہوتے رہے ۔ اس لئے ہندوستانی لوگوں کو کسی ایک نسل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ۔

ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں 14 زبانیں خاص ہیں ۔ ان کے علاوہ سیکڑوں دوسری زبانیں ہیں جن میں مقامی زبانیں بھی شامل ہیں ۔ شمالی ہندستان کی زبانوں میں ہندی، گجراتی، بنگالی، مراٹھی، اڑیا، آسامی، سندھی، پنجابی اور اردو اہم ہیں ۔ ان زبانوں میں زیادہ تر سنسکرت سے نکلی ہیں ۔ جنوبی ہندوستان کی اہم زبانیں تامل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم ہیں ۔ یہ سب سنسکرت سے بھی پرانی "دراوڑی" سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اگرچہ جنوبی ہندوستان کی زبانیں سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہیں پھر بھی شمال اور جنوب کی زبانوں کی فرہنگ اور قواعد میں نمایاں فرق ہے ۔ مذکورہ بالا زبانوں میں سے ہر ایک کا رسم خط علیحدہ علیحدہ ہے ۔ ہندوستان کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہندو مذہب کی پیرو ہے ۔ یہاں تقریباً 83

فی صدی افراد ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام سے تعلق رکھنے والوں کا تناسب 11 فی صدی ہے۔ ان کے علاوہ عیسائی، سکھ، بدھ، جین اور یہودی مذہبوں کے ماننے والے بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً 80 فی صدی افراد دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور جملہ کارکنوں میں تقریباً 70 فی صدی کسان اور زرعی مزدور ہیں۔

سیاسی طور پر ہندوستان 22 صوبوں اور 9 مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں منقسم ہے۔ (بائیسواں صوبہ سکم ہے جسے باقاعدہ صوبہ کی حیثیت اپریل 1975 میں حاصل ہو چکی ہے)۔ پورے ہندوستان میں تقریباً 5 لاکھ 76 ہزار گاؤں اور 2650 شہری بستیاں ہیں۔ ان تمام علاقوں میں رہنے والی مجموعی آبادی مختلف خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کتاب میں آبادی کی خصوصیات کے علاوہ اس کی "تقسیم" اور "اضافہ" کا مطالعہ بھی پیش کیا جائے گا۔

آبادی

دنیا کے زیادہ تر مسائل براہ راست یا بالواسطہ آبادی کی کثرت اور اس کے اضافے کی تیز رفتاری سے متعلق ہیں۔ آبادی کے عالمی بحران کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ اور تشریح ضروری ہے۔ آبادی کا مطالعہ علاقائی اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اس مطالعہ میں عام طور سے باشندوں کی سابقہ اور موجودہ تعداد کے علاوہ ان کی تقسیم، ان کی خصوصیات اور ان کے اجتماعی مسائل کو شامل کیا جاتا ہے۔

سابقہ و موجودہ تعداد کے تقابلی مطالعہ سے آبادی میں اضافے کی وضاحت ہوتی ہے۔ آبادی میں اضافہ عام طور سے "مثبت" ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات آبادی میں کمی واقع ہونے کے عمل کو بھی اصطلاحاً اضافۂ آبادی کہتے ہیں۔ فرق کرنے کے لیے آبادی میں کمی واقع ہونے کو 'منفی اضافہ' کہتے ہیں۔ آبادی کی تقسیم کے مطالعہ سے علاقائی پہلو سامنے آتا ہے۔ مختلف چھوٹے بڑے علاقوں، خطوں یا ملکوں میں منقسم باشندوں کی تقسیم اور تعداد کا مطالعہ موازنہ، تجزیہ اور تشریح کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔ لفظ تقسیم صرف تعداد کی تقسیم تک ہی محدود نہیں بلکہ آبادی کے تقریباً ہر پہلو کا مطالعہ علاقائی تقسیم کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ باشندوں کی خصوصیات کے لحاظ سے آبادی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عام طور سے یہ خصوصیات فطری، سماجی اور اقتصادی ہوتی ہیں۔ فطری خصوصیات میں عمر اور جنس شامل ہیں۔ سماجی اور اقتصادی پہلو چونکہ بہت وسیع ہیں اس لیے ان سے متعلق خصوصیات بھی بہت سی ہیں۔ جن خصوصیات کا زیادہ تر

مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں پیشہ، مذہب اور زبان شامل ہیں۔ آبادی میں دیہی اور شہری تفریق بھی ایک اہم بات ہے۔ آبادی میں اضافے سے مذکورہ تمام خصوصیات میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے، جس کے نتیجے میں مختلف قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں اقتصادی مسائل زیادہ اہم اور توجہ کے قابل ہیں۔

آبادی کے مطالعے کے تعدادی طریقے

آبادی کی صرف تعداد کا مطالعہ بذاتِ خود بے مقصد ہوگا جب تک کہ اس کا تعلق کسی دوسری تعداد سے نہ قائم کیا جائے۔ اعداد کو بامقصد بنانے اور ان سے مفید نتائج اخذ کرنے کے لیے بہت سے تعدادی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ آبادی کے مطالعے میں جابجا استعمال ہونے والے تعدادی طریقوں میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

وسط سال کی آبادی (مڈ ایر پاپولیشن) — کسی سال کی آبادی اصل میں اس سال کے وسط میں موجود افراد کی کل تعداد ہوتی ہے۔ یکم جنوری سے 31 دسمبر تک پیدائش اور موت کے واقعات مسلسل ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے آبادی کی تعداد میں سال بھر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے سال کے وسط کو وہ لمحہ تسلیم کرلیا جاتا ہے جب منفی اور مثبت محرکات اصولی طور پر اپنا نصف اثر دکھا چکے ہوتے ہیں۔ اس لمحہ یعنی یکم جولائی کے سیاق و سباق میں لگایا گیا آبادی کا تخمینہ مذکورہ سال کے افراد کی اوسط تعداد بتاتا ہے۔ آبادی کے اعداد و شمار مردم شماری یا سول رجسٹریشن کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں۔ مردم شماری سال میں چاہے کسی بھی دن کی گئی ہو، وسط سال کی آبادی کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اندراج کا طریقہ یہ ہے:

$$\text{مطلوبہ آبادی} = م_1 + \frac{د}{س} (م_2 - م_1)$$

$م_1$ = پہلی مردم شماری کے مطابق آبادی کی کل تعداد

$م_2$ = بعد والی مردم شماری کے مطابق کل تعداد

س = دونوں مردم شماریوں کا درمیانی وقفہ

د = پہلی مردم شماری اور مطلوبہ تاریخ کا درمیانی وقفہ

اور اگر اعداد و شمار "مسلسل اندراج" سے حاصل کیے گئے ہیں تو وسط سال کی آبادی برابر ہوگی

$م_1 + \frac{1}{2}(م_2 - م_1)$

یہاں، $م_1$ = یکم جنوری کی کل آبادی، $م_2$ = 31 دسمبر کی آبادی

تناسب — اعداد و شمار کے مابین موازنہ کرنے کے لیے تناسب دریافت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر دو صوبوں کے درمیان معیارِ تعلیم کا موازنہ کرنا ہے تو ان صوبوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی محض تعداد معلوم کر لینے سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہر صوبے میں کل آبادی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں تناسب معلوم کرنا ہوگا، تبھی دونوں اعداد کا موازنہ ممکن ہوگا۔ دو عددوں کے درمیان تناسب دریافت کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس میں سے ایک کو شمارکنندہ اور دوسرے کو نسب نما تسلیم کر لیا جائے۔ اس صورت میں دونوں اعداد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری قسم ایسی بھی ہے جس میں شمارکنندہ نسب نما کا ایک جزو ہوتا ہے اور خارج قسمت کی قیمت صفر اور ایک کے درمیان ہوتی ہے۔ ان کی علامتی صورت یہ ہوتی ہے — $\left(\frac{ا}{ا+ب}\right)$۔ تناسب کو 100 سے ضرب دے کر اعدادِ فی صدی حاصل کیے جاتے ہیں۔

جنسی تناسب — مردوں اور عورتوں کی تعداد کے درمیان تناسب کو جنسی تناسب کہتے ہیں۔ زیادہ تر مردوں کی تعداد کو شمارکنندہ تسلیم کیا جاتا ہے اور تناسب کو 100 سے ضرب دیتے ہیں۔ اس طرح حاصل جنسی تناسب "مرد فی سو عورتیں" بتاتا ہے۔ دوسری صورت میں "عورتیں فی سو مرد" بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اس صورت میں مردوں کی تعداد نسب نما ہوگی۔

آبادی کا گھنا پن — آبادی اور رقبے کا تناسب آبادی کے گھنے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ آبادی کا تعلق بنیادی طور پر کسی نہ کسی علاقے یا جگہ سے ہوتا ہے اور جگہ کا وجود اس کے رقبے پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک ہی رقبے والی دو جگہوں پر آبادی کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دو جگہوں کی آبادی برابر اور رقبے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہر صورت میں دونوں جگہوں کی آبادی کا گھنا پن مختلف ہوگا۔ اس تناسب میں عام طور سے آبادی کی تعداد شمارکنندہ رکھی جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ تناسب "اشخاص فی مربع رقبے کی اکائی" بتاتا ہے۔ مختصر طور پر، آبادی کا گھنا پن = $\frac{\text{آبادی}}{\text{رقبہ}}$

شرحیں — شرح بھی ایک طرح کا تناسب ہے جس میں وقت کی اکائی کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ آبادی کے مطالعوں میں یہ اکائی عام طور پر ایک سال ہوتی ہے۔ شرح کا استعمال زیادہ تر پیدائش، موت اور مہاجرت جیسے اہم واقعات کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ آبادی میں اضافے

کی شرح کا استعمال بھی بہت زیادہ ہوتا ہے ۔

آبادی میں اضافے کی شرح ـــ آبادی میں تبدیلی مسلسل ہوتی رہتی ہے ۔ اگرچہ یہ تبدیلی پیدائش، موت اور مہاجرت کی وجہ سے ہوتی ہے، پھر بھی اس کا اندازہ آبادی کی مجموعی تعداد سے لگ جاتا ہے ۔ آبادی میں تبدیلی، یعنی کمی یا زیادتی، سابقہ آبادی کی تعداد (م 1) اور بعد کی آبادی تعداد (م 2) میں تفریق کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے ۔ یہ تبدیلی آبادی میں اضافے کو ظاہر کرتی ہے، اور اضافے کا درجہ مندرجہ ذیل طریقے سے معلوم کرتے ہیں :

$$\frac{م_2 - م_1}{م_1} = \left(\frac{م_2}{م_1} - 1\right)$$

اضافے کا درجہ فی سال کے حساب سے معلوم کیا جاتا ہے ۔ دراصل آبادی میں تبدیلی سال بہ سال مسلسل ہوتی رہتی ہے اور ہر سال اصل آبادی (م 2 ـــ م 1) کے برابر اضافہ ہوجاتا ہے ۔ لہٰذا آبادی میں اضافے کی شرح سود مرکب کی مانند دریافت کی جاتی ہے ۔ اس طرح سابقہ اور مابعد آبادی میں تناسب اور سالانہ شرح میں مندرجہ ذیل نسبت ہوتی ہے :

$$\frac{م_2}{م_1} = (1 + ش)^{س}$$

یہاں "س" مدت اور "ش" آبادی کی شرح اضافہ ہے ۔ مذکورہ مساوات کو ریاضی کے لوگارِدم کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے اور "ش" کی قیمت دریافت کی جاسکتی ہے :

$$ش = \sqrt[س]{\frac{م_2}{م_1}} - 1$$

موت اور پیدائش کی خام شرحیں ـــ پیدائش، موت اور مہاجرت تین اہم واقعات ہیں جو آبادی میں اضافے کے محرکات ہیں ۔ ان واقعات کے اعداد و شمار سے شرحیں دریافت کی جاتی ہیں ۔ پیدائش سے متعلق شرح "پیدا ہونے والوں کی تعداد فی کس فی سال" ہوتی ہے اور موت سے متعلق شرح "مرنے والوں کی تعداد فی کس فی سال" ہوتی ہے ۔ زیادہ تر پیدا ہونے والوں یا مرنے والوں کی تعداد "فی ہزار اشخاص" فی سال کے حساب سے معلوم کی جاتی ہے ۔

$$\text{موت کی خام شرح} = \frac{\text{مرنے والوں کی کل تعداد}}{\text{کل آبادی}} \times 1000$$

$$\text{پیدائش کی خام شرح} = \frac{\text{پیدا ہونے والوں کی کل تعداد}}{\text{کل آبادی}} \times 1000$$

آبادی میں فطری اضافے کی شرح ـــ پیدائش اور موت کی خام شرحوں میں فرق کو فطری اضافہ کہتے ہیں ۔ یہ ایک تبدیلی ہے جو ہر سال فی ہزار اشخاص پر ہوتی ہے ۔ یہ تبدیلی

مثبت یا منفی دونوں میں سے کسی شکل میں ہو سکتی ہے۔ فطری اضافے کی شرح معلوم کرنے کا طریقہ مندرجہ ذیل ہے :

$$\left(\frac{\text{کل پیدائش}}{\text{کل آبادی}} \times 1000\right) - \left(\frac{\text{کل اموات}}{\text{کل آبادی}} \times 1000\right) = \frac{(\text{کل پیدائش}) \quad (\text{کل اموات})}{(\text{کل آبادی})} \times 1000$$

آبادی کے اعداد و شمار

آبادی سے متعلق مطالعوں میں استعمال ہونے والے اعداد و شمار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم افراد کی خصوصیات سے متعلق ہے۔ اس میں عمر، جنس، رہائش، پیشہ اور تعلیم وغیرہ سے متعلق اعداد و شمار ہوتے ہیں۔ دوسری قسم زندگی کے اہم واقعات سے متعلق اعداد و شمار پر مشتمل ہے۔ پیدائش اور موت کے علاوہ، مہاجرت، شادی اور طلاق بھی ان اہم زندگی کے اہم واقعات میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے آبادی میں اہم تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں قسم کے اعداد و شمار حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔ عام طور سے افراد کی خصوصیات کے سلسلے میں اعداد و شمار حاصل کرنے کے لیے کسی معینہ وقت پر مردم شماری کی جاتی ہے۔ مردم شماری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی نقطۂ وقت پر تمام آبادی کا شمار ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس اہم واقعات کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ واقعات روز روز ہوتے رہتے ہیں اور کسی ایک معینہ وقت پر ان کا شمار زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کے لیے مسلسل اندراج کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر اہم واقعات کا اندراج کلینڈری سال (یکم جنوری سے 31 دسمبر تک) کے حساب سے ہوتا ہے۔ اندراج یا رجسٹریشن کا طریقہ ایسا ہے کہ اس میں واقعات کے اعداد و شمار کے علاوہ افراد کی خصوصیات سے متعلق اطلاع بھی نوٹ کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اطلاع صرف ضمنی ہوتی ہے، مثلاً بچے کی پیدائش کے ساتھ ماں کی عمر اور نسل، باپ کی عمر اور پیشہ وغیرہ۔ اسی طرح مرنے والے کی عمر، جنس، نسل وغیرہ کے متعلق اطلاع فراہم کی جاتی ہے۔ مردم شماری میں بھی کوئی ایسی قید نہیں ہوتی کہ صرف افراد کی خصوصیات سے متعلق ہی اطلاع نوٹ کی جائے۔ ضمنی طور پر اس میں زندگی کے اہم واقعات سے متعلق سابقہ اطلاع بخوبی حاصل کی جاتی ہے۔ بعض اوقات خصوصی اطلاع فراہم کرنے کے لیے خصوصی سروے کیے جاتے ہیں۔ ان میں طریقۂ کار مردم شماری جیسا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں مردم شماری کا نظام ـــــ ترقی پذیر ملکوں میں کچھ ہی ملک ایسے ہیں جن میں مردم شماری کا کام منظم طور پر کیا جاتا ہے ۔ ہندوستان بھی ایک ایسا ہی ملک ہے ۔ یہاں پر ہر دس سال بعد مردم شماری کی جاتی ہے ۔ 1941 تک یہ کام ایک خصوصی پروگرام کے تحت انجام پاتا تھا ۔ آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد حکومت نے مردم شماری سے متعلق ایک قانون بنایا جس کی رو سے شمار کنندگان اور افسران کے اختیارات بڑھ گئے ہیں ۔ 1958 میں نئی دہلی میں ایک مستقل محکمۂ مردم شماری قائم کیا گیا ۔ یہ محکمہ اصل میں رجسٹرار جنرل اور ایکس آفشیو سینسس کمشنر کا دفتر ہے ۔

جدید اصطلاح میں مردم شماری (سینسس) کا مطلب ملکی سطح پر آبادی کا شمار کرنا سمجھا جاتا ہے ۔ اس میں فرداً فرداً ہر شخص کے بارے میں اطلاع فراہم کی جاتی ہے ۔ ہندوستان میں 1867 اور 1872 کے دوران اس قسم کی باقاعدہ مردم شماری کی کوشش کی گئی ۔ اگرچہ یہ اولین کوشش نہ تو مکمل ہو سکی اور نہ اس میں وقت کی ہم آہنگی برقرار رہ سکی ، پھر بھی یہ ایک اچھی شروعات تھی ۔ دوسری مردم شماری 1881 میں کی گئی اور تبھی سے دس سالہ مردم شماری متواتر عمل بن گئی ہے ۔ پہلی مردم شماری کے سوالیہ میں گیارہ قسم کے سوالات شامل تھے ۔ ان کا تعلق عمر ، جنس ، مذہب ، شہریت ، تعلیم ، زبان ، جائے پیدائش ، ذات یا نسل ، پیشے وغیرہ سے تھا ۔ 1881 میں اس قسم کے سوالوں کی تعداد بارہ کر دی گئی تھی اور اس کے بعد ہر مردم شماری کے سوالیہ میں ترمیم ہوتی رہی ہے ۔

1971 کی مردم شماری میں چار مختلف سوالیے تیار کیے گئے تھے ۔ ایک انفرادی طور پر اشخاص سے متعلق تھا ۔ دوسرا دفتروں ، اسکولوں ، کالجوں ، ہسپتالوں اور کارخانوں سے متعلق تھا ۔ تیسرا سوالیہ مکانوں کے بارے میں تھا اور چوتھے میں انفرادی طور پر جمع کی گئی اطلاع کو یکجا کرنا تھا ۔ مردم شماری سے حاصل اعداد و شمار کو مناسب تصحیح کے بعد ترتیب دے کر شائع کیا جاتا ہے ۔

ہندوستان میں سول رجسٹریشن (نظامِ اندراج) ـــــ زندگی کے اہم واقعات کے اندراج کا کام مستقل طور پر مسلسل چلتا رہتا ہے ۔ اس میں دوسرے ان تمام واقعات کو بھی شامل کیا جاتا ہے جن کے باعث آبادی میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں رجسٹریشن کا کام انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا ۔ 1869 میں محکمۂ حفظانِ صحت کے کمشنر نے

ہندوستان میں رجسٹریشن رائج کرنے کی سفارش کی تھی اور کچھ اصولوں کا بھی تعین کیا تھا۔
شروع میں زیادہ زور صحت سے متعلق اطلاع فراہم کرنے پر تھا۔ لہٰذا موت اور سبب موت کا
اندراج خصوصی طور پر کیا جاتا تھا۔ 1873 میں بنگال کی ریاستی حکومت نے پیدائش اور
موت سے متعلق رجسٹریشن کا قانون بنایا تھا، جس کو بعد میں بہار اور اڑیسہ کے صوبوں نے
بھی اپنا لیا تھا۔ 1886 میں مرکزی حکومت نے پیدائش، موت اور شادی سے متعلق قانون
پاس کیا لیکن اس میں اندراج کا کام رضاکارانہ تھا۔ پھر بھی 1903 تک ہندوستان کی تقریباً
80 فی صدی آبادی اس نظام کے تحت آگئی تھی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران رجسٹریشن
میں کافی بدنظمی پیدا ہوگئی اور کچھ ہی دنوں پہلے تک ہندوستان میں کوئی ایسا قانون نہیں تھا جس
کی رو سے اندراج کا کام لازمی طور پر پورے ملک میں عمل میں آسکتا۔ اگرچہ میونسپل اور صوبائی
سطحوں پر رجسٹریشن عملی طور سے لازمی قرار دیا جاتا تھا لیکن مرکزی حکومت نے موت اور پیدائش
کے اندراج کا قانون 1969 میں بنایا ہے۔ اس وقت جغرافیائی اعتبار سے پورے ملک میں
رجسٹریشن رائج ہے، لیکن واقعات کا جامع اندراج اب بھی نہیں ہو پاتا۔

خام اعداد و شمار کا رکارڈ مقامی رجسٹریشن آفس میں رہتا ہے۔ دیہی علاقوں میں
پنچایت، پولس یا لگان کا محکمہ مقامی رجسٹرار کا کام انجام دیتا ہے۔ شہری علاقوں میں اس کام
کی ذمہ داری زیادہ تر میونسپلٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ مرکزی ذمہ داری ہندوستان کے رجسٹرار
جنرل کی ہوتی ہے۔ وہی اس مکمل نظام کی نگرانی کرتا ہے۔ واقعات کو یکجا کر کے شائع کرنا بھی
اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ تاہم ابتدائی ذمہ داری ہر اس شخص کی ہے جس کے گھر میں
کوئی بھی قابل اندراج واقعہ رونما ہو۔ ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ ہونے والے واقعہ کا
اندراج مقامی رجسٹریشن آفس میں جلد سے جلد کرائے۔ شروع شروع میں یہ کام رضاکارانہ تھا۔
اب 1969 سے قدرے سختی کی جارہی ہے۔ میونسپل علاقے میں پیدائش کی اطلاع زیادہ سے زیادہ
سات دن کے اندر پہنچ جانی چاہیے، اور موت کی اطلاع تین دن کے اندر۔ دیگر علاقوں میں یہ مدت
بالترتیب 14 اور 7 دن ہے۔ اب شادی کے لازمی اندراج کی بھی تجویز ہے۔

ہندوستان میں عمرانیاتی مطالعے

ہندوستان میں عمرانیاتی مطالعوں کی شروعات موجودہ صدی میں، 1930 کی دہائی سے،

ہوئی ۔ آبادی سے متعلق سب سے پہلی کانفرنس (انڈین پاپولیشن کانفرنس) 1936 میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس سے پہلے عمرانیات میں بہت کم دلچسپی لی جاتی تھی ۔ 1916 میں پی، کے، وٹل نے "ہندوستان میں مسئلۂ آبادی" کے عنوان سے ایک قابل ذکر مطالعہ پیش کیا تھا۔ 1925 میں آر، ڈی، کاروے نے بمبئی میں ضبطِ تولید کے لیے ایک کلینک قایم کی اور 1928 میں مدراس میں "نیو مالتھوسین لیگ" کی تشکیل ہوئی ۔ لیکن اس سلسلے میں تعمیری کام میں تیزی 1936 کے بعد ہی آئی ۔ اسی سال اے، پی، پلائی نے "میرج ہائی جین" (ازدواجی حفظانِ صحت) نام کا رسالہ شایع کرنا شروع کیا ۔ 1938 میں بمبئی میں ایک کانفرنس ہوئی جو دوسری "آل انڈیا پاپولیشن کانفرنس" تھی اور پہلی "فیملی ہائی جین کانفرنس" جس کی صدارت رادھا کمل مکھرجی نے کی تھی ۔ اس وقت سیاسی حلقے میں بھی عمرانیات سے کافی دلچسپی لی جانے لگی تھی ۔ 1937 میں نیشنل پلاننگ کمیٹی نے پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں خوشحالی اور منصوبہ بندی کے لیے ضبطِ تولید کی سفارش کی ۔ اس وقت کے قابل ذکر مطالعے دو ہیں ۔ ایک تو ڈاکٹر آر، کے، مکھرجی کا "چالیس کروڑ کے لیے غذائی منصوبہ" (1938) اور دوسرا پروفیسر گیان چند کا "ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مطالعہ" (1939) ۔ ان کے علاوہ علاقائی زبانوں میں بھی بہت سی کتابیں شایع ہوئیں جو زیادہ تر مغرب کی انگریزی کتابوں کے بالواسطہ ترجمے تھے ۔

مذکورہ بالا عمرانیاتی مطالعوں میں "مسئلہ آبادی" کا تجزیہ مفقود ہے ۔ اصل میں ایک تو اس وقت آبادی میں اضافے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی جتنی کہ اب ہے، اور دوسرے آبادی کے مسئلے کی اہمیت پر مفکرین کا ذہن کم ہی جاتا تھا ۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت بھی آبادی میں اضافے کو روکنے اور اس سلسلے میں کوئی منصوبہ بنانے کے حق میں نہیں تھی ۔ اس ضمن میں جو کچھ ترقیاتی کام ہوا وہ آزادی کے بعد ہوا ہے ۔

1949 میں بمبئی میں "فیملی پلاننگ اسوسیشن" کی تشکیل ہوئی ۔ تبھی سے آبادی کے مسئلے میں واقعی دلچسپی لی جانے لگی ۔ مارچ 1950 میں ہندوستان میں پلاننگ کمیشن قایم کیا گیا جس نے 1951 میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کا کام آبادی میں اضافے اور خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلوں کے بارے میں رپورٹ تیار کرنا تھا ۔ اس کمیٹی کی دو ضمنی کمیٹیاں تھیں، ایک آبادی کی پالیسی سے متعلق اور دوسری تحقیقی امور اور پروگراموں سے متعلق ۔ دوسری ضمنی کمیٹی

کا کام حکومت کے سامنے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق سفارشات پیش کرنا تھا۔
1956 میں مرکزی خاندانی منصوبہ بندی بورڈ کی تشکیل کے بعد ایک اور ضمنی کمیٹی بنائی گئی جس کا تعلق عمرانیات سے تھا۔ اس ضمنی کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر وی، کے، آر، وی راؤ تھے اس کمیٹی کے کارناموں میں بمبئی کا "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار پاپولیشن اسٹڈیز" اور عمرانیات سے متعلق تحقیقی مراکز کا قیام ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں اس طرح کے تحقیقی مراکز کی تعداد بارہ ہے۔ ان مراکز کا مقصد پیدائش اور موت اور ان سے متعلق محرکات کا مطالعہ کرنا ہے۔
نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیملی پلاننگ، نئی دہلی، اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار پاپولیشن اسٹڈیز، بمبئی، عمرانیات کی عمدہ تعلیم گاہیں ہیں جن سے ملکی اور بیرونی طلبا مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سینسس کمشنر اور رجسٹرار جنرل آف انڈیا کا دفتر، سینٹرل اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن اور نیشنل سیمپل سروے بھی مخصوص سرکاری محکمے ہیں جو عمرانیات اور آبادیات سے متعلق اعداد و شمار فراہم کرنے اور ان پر تحقیقی مطالعے ترتیب دینے کا کام کرتے ہیں۔

ہندوستان کے نصابِ تعلیم میں ابھی تک عمرانیات اور آبادیات کو کم جگہ دی گئی ہے۔ صرف چند اداروں میں یہ علوم اختیاری مضامین کی حیثیت سے، وہ بھی محض پوسٹ گریجویٹ سطح پر، اقتصادیات، سماجیات، شماریات یا جغرافیہ کے ضمن میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عمرانیات اور آبادیات کو عام طور پر پڑھایا جائے۔ امید ہے کہ وزارتِ تعلیم کی مدد سے اب آبادیاتی مطالعوں کو عام کیا جائے گا۔

باب 2

آبادیاتی نظریات

آبادی کے مسئلے کا آج کل کافی چرچا ہے۔ علمی شعبوں کے علاوہ اس کا ذکر عموماً اس وقت کیا جاتا ہے جب مادی وسائل کی تقسیم زیر بحث آتی ہے۔ یعنی مادی وسائل کی تقسیم کو آبادی کی تقسیم سے منسلک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن علمی شعبوں میں آبادی کے مطالعے کی نوعیت اور ہے۔ ایک طرف تو ماہرین زیادہ سے زیادہ موزوں عمرانیاتی طریقوں کو دریافت کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف دریافت شدہ طریقوں کے ذریعے حاصل کیے ہوئے آبادیاتی حقائق کا تجزیہ اور توجیہ کرتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آبادیات کا مطالعہ کرنے والے ماہرین مختلف علوم سے وابستہ ہوتے ہیں، جن میں حیاتیات، عضویات، سماجیات، اقتصادیات، ریاضیات، طبیعات اور فلسفہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہر علم کا ماہر اپنے طور پر آبادی اور اس میں اضافے کے بارے میں نظریہ قایم کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر مختلف پس منظروں میں مختلف نظریے سامنے آتے ہیں۔

آبادی کے مطالعے میں زیادہ تر توجہ اضافۂ آبادی پر، خاص طور پر افزائش نسل، پر دی جاتی ہے کیونکہ آبادیات کا یہی عنصر مسئلہ کا بنیادی جزو ہے۔ شروع سے ماہرین کی کوشش یہی رہی ہے کہ تاریخی پس منظر میں ہونے والی عمرانیاتی تبدیلیوں اور علاقائی اختلافات کے معقول اسباب دریافت کیے جائیں اور موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں بھی رائے قایم کی جائے۔ اس کے لیے انھیں کوئی نہ کوئی مفروضہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ آبادیات سے متعلق اعداد وشمار، سائنسی تجربات کے آمار کے برخلاف، انتہائی غیر یکساں ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان اعداد وشمار سے وابستہ دیگر عناصر بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایسے غیر یکساں اور متغیر حالات میں سماجی عناصر کا سابقہ طرز تو بخوبی معلوم ہو جاتا ہے لیکن آئندہ کے لیے کوئی رائے قایم کرنا صرف قیاس آرائی کی بات ہوتی

ہے، کیونکہ اس بات کی کبھی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ آئندہ صورت حال کسی مقررہ ڈگر پر چلے گی۔ اس لیے اب کاوش اس بات کی کی جاتی ہے کہ آبادی میں ہونے والی تبدیلیوں کی نوعیت اور طریق عمل کو زیادہ سے زیادہ سمجھا جائے تاکہ آئندہ کے بارے میں قیاس زیادہ سے زیادہ صحیح ہو۔

موجودہ آبادیاتی مفروضوں کو عام طور سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حیاتیاتی، دوسرا تہذیبی اور تمدنی (سماجیاتی)، اور تیسرا اقتصادیاتی۔ یہ تقسیم محض مطالعہ کی سہولت کے لیے کی گئی ہے کیونکہ کوئی بھی مفروضہ پوری طرح نہ تو حیاتیاتی ہے، نہ تہذیبی اور نہ ہی اقتصادیاتی۔ پھر بھی ہر مفروضہ مذکورہ تینوں میدانوں میں سے کسی ایک سے زیادہ متعلق ہوتا ہے۔ حیاتیاتی مفروضوں میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسانوں میں افزائشِ نسل کا عمل اتنا ہی فطری ہے جتنا نباتات اور حیوانات میں ہے۔ سماجیاتی مفروضوں میں عمرانیاتی تبدیلیوں کو انسان کے نفسیاتی پہلو سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ نفسیات میں جن چیزوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ ہیں قوت ارادہ، عقل، لذتیت اور دور اندیشی۔ ان مفروضوں کو تہذیب و تمدن سے اس لیے وابستہ کیا جاتا ہے کہ مخصوص تہذیب و تمدن سے مخصوص نفسیات پیدا ہوتی ہیں۔ اقتصادیاتی مفروضوں میں بنیادی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سماجی تبدیلی اقتصادی محرکات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

موجودہ صدی سے پہلے زیادہ تر مفکرین کا خیال تھا کہ آبادی میں اضافہ محض خوشحالی کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن اب ماہرین نے اس نظریہ کی تردید کردی ہے۔ اس لیے کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آبادی میں اضافہ صرف اقتصادی حالات سے ہی نہیں ہوتا بلکہ تہذیبی اور تمدنی محرکات بھی اس میں عامل ہوتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آبادی میں تبدیلی اس ماحول کی وجہ سے ہوتی ہے جو مختلف عناصر کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ لہٰذا اضافۂ آبادی کا سطحی مطالعہ کسی درست نظریہ کی طرف رہ نمائی نہیں کرسکتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک بہت سے مفکرین کثیر اور بڑھتی ہوئی آبادی کے معاشی، سیاسی اور عسکری فوائد پر زور دیتے تھے اور آبادی میں اضافے کی رفتار تیز تر کرنے کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن پھر اس نظریے کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔ اسی دور میں مالتھوس نے اپنا مضمون "آبادی کے اصولوں پر ایک مقالہ" شایع کیا۔ 1798 میں اس مضمون کی اشاعت سے آبادی کے سابقہ نظریہ میں نہ صرف نمایاں تبدیلی واقع ہوئی بلکہ اس سے آبادیاتی مطالعوں

میں ایک انقلاب سا برپا ہوگیا۔ اپنے مقالے میں مال تھیوس نے یہ بات واضح کی ہے کہ انسان میں افزائش نسل کی صلاحیت اس کی اس صلاحیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جو زندگی کی ضروریات وسائل کی شکل میں پیدا کرتی ہے۔ اور یہی امر "اصول اضافۂ آبادی" ہے 2

تھامس رابرٹ مال تھیوس (1766 سے 1834) ایک برطانوی باشندہ تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں اقتصادیات کا لکچرار تھا۔ اس کے زمانے میں مغربی یورپ مختلف سماجی و اقتصادی انقلابوں سے دوچار تھا۔ اقتصادی نظام تجارتی تھا۔ اور کثیر آبادی کو اقتصادی اور فوجی طاقت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ مال تھیوس کو یہ بات صاف طور پر نظر آئی کہ آبادی میں اضافہ معاشی وسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو محض گزر بسر کی حد تک ہی وسائل رکھتے تھے۔ اس کے خیال میں انسان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ پیداوار اور آبادی دونوں کے اضافے میں تال میل پیدا کرے۔ انقلاب فرانس نے مفکرین کو انسان کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگرچہ سائنس کے میدان میں ترقی اس بات کا یقین دلا رہی تھی کہ انسانی ضروریات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے، تاہم مال تھیوس کو یقین تھا کہ بڑھتے ہوئے وسائل بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

مال تھیوس کا نظریہ دو دعووں اور ایک مفروضے پر مبنی تھا۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ انسان کے زندہ رہنے کے لیے غذا ضروری ہے۔ دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان پرجوش جنسی تعلق فطری ہے اور یہ جنسی تعلق تقریباً اسی صورت سے برقرار رہے گا۔ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ غذا کی پیداوار سلسلۂ ریاضی کے مطابق بڑھتی ہے اور آبادی سلسلۂ ہندسیہ کے مطابق۔ یعنی

غذا کی پیداوار — 1 — 2 — 3 — 4 — 5 — 6 — 7 وغیرہ

آبادی میں اضافہ — 1 — 2 — 4 — 8 — 16 — 32 — 64 وغیرہ

مال تھیوس نے ہر دو ہندسوں کے درمیان تقریباً 25 سال کا وقفہ تصور کیا تھا، جس میں آبادی کے دگنے ہو جانے کا امکان تھا، بشرطیکہ کوئی معاشی رکاوٹ نہ پڑے۔ چنانچہ اگر اضافۂ آبادی کا سلسلہ جاری رہے تو 150 سال میں وہ اصل کی 64 گنا ہو جائے گی، جب کہ غذائی ترقی میں صرف 7 گنا اضافہ ہوگا۔ یہ بات بالکل درست تو نہیں ہے۔ لیکن

مال تھیوس کا مقصد ان صلاحیتوں کے فرق کو واضح کرنا تھا۔ اضافۂ آبادی کی قوت، اضافۂ وسائل کی قوت سے لامحدود طور پر زیادہ ہے۔ اس لیے ہر کوشش کرنی چاہئے کہ اضافۂ آبادی پر سخت پابندیاں عائد کر کے اسے غذائی وسائل کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو سماج کے لیے اس کا نتیجہ " برائی اور مصیبت" کی شکل میں سامنے آئے گا۔

مال تھیوس نے آبادی کو بڑھنے سے روکنے کے لیے دو طرح کی پابندیوں کا ذکر کیا ہے، ایک احتیاطی اور دوسری مثبت۔ احتیاطی پابندیوں کا مطلب مصلحت اندیشی ہے، مثلاً شادی ملتوی کرنا اور بچے کم پیدا کرنا وغیرہ۔ مثبت پابندیاں وہ قدرتی پابندیاں ہیں جو جنگوں، بیماریوں، قحطوں، سیلابوں، زلزلوں وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور آبادی کو کم کرتی ہیں۔ اگر آبادی کو گزر بسر کے ذرائع کی حد سے آگے بڑھنے دیا جائے گا تو قدرتی پابندیاں خود بخود حرکت میں آجائیں گی۔

مال تھیوس پر اس کے دعووں، اس کے مفروضے اور اس کے اخذ کیے ہوئے نتائج کے سلسلے میں کافی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ لیکن اس امر کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ انسان کے لیے غذا ضروری ہے۔ غذا کے علاوہ اس کو دوسری ابتدائی اور ثانوی ضروریات بھی درکار ہوتی ہیں۔ بہر حال، مال تھیوس کا یہ دعویٰ کہ ایک وقت آئے گا جب کہ آبادی لامثال حد تک بڑھ جائے گی اور بے پناہ مصائب نازل ہوں گے غلط ثابت ہوا ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ملکوں میں شرح پیدائش کم ہوگئی ہے۔ رہے کم ترقی یافتہ ممالک تو ان کی آبادی میں تیز اضافے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شرح اموات کم ہوگئی ہے لیکن ابھی شرح پیدائش زیادہ ہے[3]۔

مائیکل تھامس سیڈلر (1780 سے 1835) مال تھیوس کا ہم عصر تھا لیکن اس کے نظریے مال تھیوس سے بالکل مختلف تھے۔ سیڈلر بھی برطانیہ کا باشندہ تھا۔ وہ سماجی اصلاح کا خواہاں ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادیات کا ماہر بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے جیسے بستیاں گنجان ہوتی جائیں گی ویسے ویسے آبادی میں اضافہ خود بخود کم ہونے لگے گا اور جب انسانوں کی ایک مخصوص تعداد بیش از بیش عیش و آرام کی حد تک پہنچ جائے گی تو اضافے کا عمل ختم ہو جائے گا۔ آبادی کا یہ نظریہ کچھ زیادہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس میں جس "عیش و آرام کی حد" کا ذکر کیا گیا ہے وہ اب تک کسی ملک میں حقیقت نہیں بن سکتی ہے۔

سیڈلر کے نظریہ کے تقریباً بیس سال بعد تھامس ڈبل ڈے (1790 سے 1870) نے اضافۂ آبادی کو رسد غذا سے وابستہ بتایا۔ وہ بھی برطانیہ کا باشندہ، اقتصادیات کا ماہر اور فلسفہ داں تھا۔ اس کے خیال میں آدمی کو جتنی اچھی غذا ملتی ہے اتنا ہی آبادی میں کم اضافہ ہوتا ہے۔ تقریباً نصف صدی بعد جوزے ڈی کیسٹرو نے اپنی کتاب "جاگرفی آف ہنگر" (اشتہا کا جغرافیہ) میں، جو کہ 1952 میں شائع ہوئی تھی، ڈبل ڈے کے نظریے کو سائنسی شکل دینے کی کوشش کی۔ کیسٹرو کا کہنا ہے کہ انسانی غذا میں پروٹین کی زیادتی سے افزائش نسل کی صلاحیت میں کمی واقع ہوتی ہے اور پروٹین میں کمی مذکورہ صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ بات سائنسی اعتبار سے بے بنیاد معلوم ہوتی ہے کہ غذا میں پروٹین کی مقدار افزائش نسل کی صلاحیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

انسان کی افزائشِ نسل کی صلاحیت کا مظاہرہ بچوں کی پیدائش کی تعداد سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی "باصلاحیت" شخص کنبہ بندی کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرے تو وہ بچوں کی تعداد پر قابو پا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص افزائش نسل کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اس لیے کہ افزائش نسل کی صلاحیت ایک تو ظاہری ہوتی ہے اور دوسری پوشیدہ۔ صلاحیت کی ان دو قسموں میں فرق نہ کرتے ہوئے ہربرٹ اِسپینسر (1820 سے 1903) نے آبادی میں اضافے کو قطعی طور پر ایک قدرتی اصول پر منحصر بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا اگر انسان کا رجحان افزائش نسل سے ہٹانا مقصود ہو تو اسے ذاتی، سائنسی اور اقتصادی ترقی کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ وہ جتنا زیادہ اپنی ترقی کے کاموں میں مشغول رہے گا اسے اتنی ہی کم دلچسپی افزائشِ نسل سے ہوگی۔ جہاں تک افزائشِ نسل پر اس طرح کی روک کا سوال ہے، ابھی تک کسی بھی ملک میں اس قسم کی صورت حال پیش نہیں آئی ہے۔ بہر حال یہ امر مسلّم ہے کہ انسان احتیاطی تدابیر کے ذریعہ بچوں کی پیدائش پر پابندی لگا سکتا ہے۔

اطالوی ماہر سماجیات کوریڈو گنی کا اضافۂ آبادی کا نظریہ قدرتی اصول کے مفروضے سے وابستہ ہے۔ اس کے خیال میں آبادی کے اضافے کی اصل محرک حیاتیاتی تبدیلی ہے نہ کہ سماجی یا اقتصادی تبدیلی۔ جس ملک میں جوان لوگوں کی کثرت ہوتی ہے وہاں شرح پیدائش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر آبادی میں اضافہ تیزی سے ہونے لگتا ہے اور اضافۂ آبادی سے سماجی اور اقتصادی بدنظمی پیدا ہونے لگتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کثرت آبادی کا

کا دباؤ کم کرنے کے لیے حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ جنگ یا نو آبادیات یا دونوں کے ذریعے اپنے ملک کے رقبے میں توسیع کرے۔ اگر کسی طرح رقبہ وسیع ہو جاتا ہے تو آبادی کے اضافے کی رفتار میں کمی ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ یا نو آبادیات کے باعث سماج کے جوان اور طاقتور لوگوں میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کمی کی وجہ سے اضافہ آبادی کی شرح میں بھی کمی آجاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اضافہ کی شرح حیاتیاتی محرک سے متاثر ہوتی ہے اور پیدائش کی شرح میں کمی یا زیادتی افزائش نسل کی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے۔

حیاتیاتی مفروضوں کے لحاظ سے آبادی میں افزائشِ نسل کا عمل بالکل اسی طرح جاری رہتا ہے جس طرح نباتات اور حیوانات میں۔ مال تھیوس کے بعد سماجیات واقتصادیات کے بہت سے ماہرین نے آبادی میں اضافے کا مطالعہ سماجی واقتصادی سیاق وسباق میں کیا۔ ظاہر ہے کہ سماجی اور اقتصادی حالات کو کبھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اگر ڈبل ڈے اور کیسٹرو کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ افزائش نسل غذا میں پروٹین کی مقدار سے متعین ہوتی ہے تو فطری طور پر سوال اٹھتا ہے کہ آبادی میں غذائیت کی تقسیم کی کتنی ناہمواریاں ہیں۔ لیکن چونکہ حیاتیاتی نظریے کے حامی اقتصادی اور سماجی پہلو کو ضمنی طور پر لیتے ہیں اس لیے ان کے وضے سماجی اور اقتصادی زمرے میں شامل نہیں کیے جاتے۔ سماجیاتی مفروضوں میں اضافہ آبادی کو انسانی نفسیاتی خصوصیات سے مربوط کیا جاتا ہے چونکہ نفسیات کا تعلق تہذیب وتمدن سے بھی ہے اس لیے ان مفروضوں کو "تہذیبی مفروضے" بھی کہتے ہیں۔

ہنری جارج (1839 سے 1897) اقتصادیات کا ایک امریکی ماہر تھا۔ اس نے اپنی کتاب "پروگریس اینڈ پاورٹی" (ترقی اور غربت) میں، جو کہ 1879 میں شائع ہوئی تھی، جس آبادیاتی نظریے کو پیش کیا ہے اس کو سماجیاتی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ جارج نے اپنے دور کے نظام کو مدنظر رکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر زمین کی ذاتی ملکیت کو ختم کر کے اس کا کرایہ وصول کیا جانے لگے تو مزید کسی ٹیکس کی ضرورت نہیں ہوگی اور ایسی صورت میں ہر شخص زمین کا استعمال اپنی سکت کے مطابق بہترین طور پر کرے گا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ زمین سے وسائل کے حصول میں بھی تیزی آئے گی۔ اس طرح جارج کے نظریے کے مطابق آبادی میں اضافہ کسی دوسری حیاتیاتی چیز میں اضافے سے قطعی مختلف ہے، اور آبادی میں اضافہ سے غذائی وسائل میں اضافہ کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر انسان پیدائش کی شرح پر رضاکارانہ احتیاطی تدابیر کے ذریعے قابو پانے کی کوشش کرتا ہے [4]

فرانسیسی پروفیسر ارسنے دیو مانٹ (1849 سے 1902) کا نظریہ مغربی ملکوں خصوصاً اس کے اپنے ملک کے سماجی حالات کی بنا پر تھا۔ اس کے آبادیاتی نظریے کو "سوشل کیپی لیرٹی" (سماجی شعریت) کا مفروضہ کہا جاتا ہے۔ طبیعات کے عمل شعریت کی طرح تہذیب یافتہ سماجوں میں بھی عمل شعریت ملتا ہے۔ سماجی قدروں کے لحاظ سے ہر انسان کی حیثیت جداگانہ ہوتی ہے اور ہر انسان اپنی موجودہ حیثیت کو پہچانتے ہوئے اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ سماج میں بلند ترین حیثیت حاصل کرے۔ اس خواہش کی تکمیل میں اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس رہتا ہے۔ دیو مانٹ کا خیال ہے کہ تہذیب یافتہ سماجوں میں شرح پیدائش میں کمی اسی خواہش کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس خواہش کی بنیاد یہ یقین ہے کہ انسان اپنے کنبے کو مختصر رکھ کر اس کی بہتر پرورش کر سکتا ہے۔

اقتصادیات کے ماہرین نے جن آبادیاتی نظریوں کو پیش کیا ہے ان سب کی بنیاد مادی وسائل پر ہے۔ ان کے خیال میں سماج میں واقع ہونے والی ہر تبدیلی اقتصادی محرکات کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ سماجیاتی تجزیہ میں اقتصادی محرکات کی اہمیت محسوس کرنے میں کارل ہنرک مارکس (1818 سے 1883) کا نام پیش پیش ہے۔ مارکس ایک جرمن فلسفہ داں تھا جس نے فریڈرک اینجلس کے ساتھ جدید کمیونسٹ مفروضے کی بنیاد رکھی تھی۔ مارکس نے مالتھیوس کے نظریۂ آبادی کو رد کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ آبادی کی نامناسب زیادتی سرمایہ دارانہ نظام کے باعث ہوتی ہے۔ چونکہ سماج کا جوان طبقہ ہی سماج کی بنیاد اور حصول وسائل کا ماخذ ہے، اس لیے اس طبقے میں اضافہ سماج کے مفاد میں ہے۔ شرط یہ ہے کہ نظام اشتراکی ہو اور سماج میں ہر فرد کے لیے روزگار مہیا ہو اور وسائل کا متوازن استعمال ہو۔ ایسی صورت میں بڑھتی ہوئی آبادی بھی خوشحال رہ سکتی ہے 5 مارکس کا آبادی کا نظریہ اصل میں تاریخ کی اقتصادی تفسیر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ ماضی میں کیا حالات رہے ہیں۔ اس لیے اس کو تاریخی مادیت بھی کہا جاتا ہے 6

اگر دنیا کی موجودہ آبادی کا مطالعہ کیا جائے تو مالتھیوس اور مارکس دونوں کے نظریوں کی تردید ہوتی ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ملکوں میں آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ معیار زندگی بھی بلند ہوتا رہا ہے۔ دوسری طرف روس اور چین جیسے اشتراکیت پسند ممالک مارکس کے نظریے کو اپناتے ہوئے بھی نسل کی افزائش پر پابندی کے حامی ہیں۔ بہر حال

مارکس کا یہ نظریہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کو درست کر کے زندگی کا معیار اونچا کیا جا سکتا ہے۔ تاہم آسبورن اور واگٹ (1948) جیسے قدامت پسند اشخاص نے دعویٰ کیا ہے کہ آج آدمی ارضی وسائل کو کثیر تعداد میں حاصل کر کے اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں آگ لگا رہا ہے۔ آئندہ آنے والی نسلوں کو شدید دقت کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ ان کی تعداد زیادہ ہوگی اور ان کے لیے وسائل کے ذخیرے بہت کم باقی بچے ہوں گے۔ بہر حال اس نظریے سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ حصولِ وسائل اور استعمالِ وسائل کے لیے ایک بہتر نظام رائج کرنا چاہیئے۔

اصل میں آبادی کا معاشی حالات سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ جن ماہرین نے آبادی کو معاشیات سے الگ کر کے اس کا مطالعہ کیا ان کے نظریے کبھی درست ثابت نہیں ہوئے۔ کونز نے کئی یورپی اور امریکی ماہروں کی پیشین گوئیوں کا تجزیہ کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ بعض اندازے ایسے ہیں جن میں 50 فی صدی تک کی غلطی تھی اور اگر کہیں کوئی اندازہ صحیح ثابت ہوا وہ محض اتفاق تھا۔ 1950 کے قریب ہی لوگوں کو احساس ہو گیا تھا کہ علم آبادیات کا بڑے سے بڑا ماہر بھی پانچ یا دس سال بعد کی آبادی کے بارے میں قابلِ اعتماد اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہ ناکامی آبادیات کو اقتصادیات سے علیحدہ کر دینے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کونز کا خیال ہے کہ آبادی کے مفروضے کا مطالعہ اقتصادیات کے پس منظر میں کرنا چاہیئے۔ آبادی، اقتصادیات کے قدیم ماہروں کے مطابق "منحصر" اور جدید ماہروں کے مطابق "غیر منحصر" طور پر بدلتی ہے اور اس میں اس تہذیب و تمدن کا ہاتھ ہوتا ہے جو مخصوص اقتصادی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے [7]

آبادی کے اقتصادی تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی حالت بہتر ہونے سے افزائشِ نسل میں کمی ہونا امر لازم نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے آخر سے موجودہ صدی کے وسط تک غریب طبقے میں افزائشِ نسل میں کمی کی کوئی اقتصادی توجیہ نہیں ملتی۔ اس کے لیے "مزدوروں کی کھپت" کا تاریخی پہلو دیکھنا پڑتا ہے [8] افزائشِ نسل کے طرز میں تبدیلیوں کی وجہ وہ توازن ہے جو آبادی اور مزدوروں کی کھپت کے درمیان ہوتا ہے۔

یہاں جن آبادیاتی نظریوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ تقریباً ہر قسم کے نظریوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ تمام نظریے زمانۂ ماضی میں ہونے والی عمرانیاتی تبدیلیوں اور علاقائی اختلافوں کی معقول توجیہہ تو کرتے ہیں، لیکن مستقبل میں عمرانیاتی صورتِ حال کے بارے میں محض قیاس آرائی

کرتے ہیں۔ اس لیے ان تمام نظریوں کی اہمیت عملی کم، اور تاریخی اور علمی زیادہ ہے۔ عملی میدان میں ان نظریوں کی خامیوں کا احساس موجودہ صدی کے وسط سے ہی ہو چلا تھا جب جوزیف ڈیوس 9 جیسے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ بڑے سے بڑا عمرانیات کا ماہر بھی آئندہ آبادی کے بارے میں کوئی معتبر بات نہیں بتا سکتا۔ پھر بھی ماہرین نے اندازے پیش کیے ہیں۔ 1950 کے آس پاس بہت سے ماہرین نے ہندوستان کی آبادی کے بارے میں 1961 سے 1971 کے تخمینے پیش کیے تھے 10 یہ تمام تخمینے حقیقی تعداد سے کم ثابت ہوئے۔ آئندہ پانچ سال کے تخمینوں میں یہ فرق $\frac{1}{2}$ 2 کروڑ سے $\frac{3}{4}$ 9 کروڑ تک تھا۔ اس کے برخلاف 1960 کے آس پاس اور اس کے بعد ماہروں نے جو اندازے لگائے وہ حقیقی تعداد سے زیادہ تھے۔ ہندوستان اور اقوام متحدہ کے ماہرین نے مختلف عمرانیاتی عنصروں کی بنا پر جس توقع کا اظہار کیا تھا اس میں 70 لاکھ سے 2 کروڑ 20 لاکھ تک کا فرق تھا۔

آبادی اور وسائل

آبادیات اور عمرانیات کے ماہرین کسی ملک یا علاقے کی آبادی کو اس ملک یا علاقے کے وسائل سے مربوط کرتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ موجود وسائل کے اعتبار سے افراد کی "کم ترین"، "مناسب ترین" اور "بیشترین" تعداد کیا ہونی چاہیے۔ کون سا علاقہ کب "زائد آبادی" والا علاقہ اور کون سا کب "کم آبادی" والا علاقہ کہلائے گا۔ اس بارے میں معلومات حاصل کرنا اور فیصلہ کرنا خاصا دشوار ہے۔ اول تو وسائل کا تعدادی اعتبار سے اندازہ لگانا آسان نہیں ہے اور دوسرے ہر جگہ کی آبادی کی ضروریات یکساں نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں ضروریات اور وسائل کے توازن کا اندازہ کرنے کے لیے محض اقتصادی معیار کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا بلکہ سماجی محرکات کا مطالعہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

زائد آبادی، کم آبادی، مناسب ترین آبادی، بیشترین آبادی، اور کم ترین آبادی کے تصورات جگہ اور وقت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ کسی ایک خطے کی مناسب ترین آبادی کسی دوسرے ہم قسم خطے کی زائد یا کم آبادی ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہاں کے لوگوں کی اقتصادی اور سماجی خصوصیات مختلف ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سماجی اور اقتصادی شعبوں میں تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ آج کی مناسب ترین آبادی کل کی زائد آبادی ہو سکتی ہے۔

مناسب ترین آبادی ـــــ کین ٹلان نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں "مناسب ترین آبادی" کا تصور پیش تھا۔ اس تصور میں محض وسائل ہی زیر مطالعہ نہیں آتے بلکہ سماجی رسم و رواج کو بھی مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ اس نظریے میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ آبادی میں اضافے سے لوگوں کی زندگی کا معیار بلند ہوگا یا پست۔ عام طور پر مناسب ترین آبادی کے تصور کو اقتصادیات سے منسلک کیا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ معینہ تکنیکی اور اقتصادی حالات میں سب سے زیادہ فی کس پیداوار کے لیے افراد کی کیا تعداد ہونی چاہئے۔ اسی طرح فوجی طاقت اور سماجی بہبود کے اعتبار سے آبادی کی مناسب ترین تعداد معلوم کی جاسکتی ہے۔

زندگی کے بلند معیار کا اندازہ مناسب طور پر مکمل روزگار، وسائل میں معقول ترقی اور متوازن عمرانیاتی ساخت جیسی علامتوں سے کیا جاتا ہے۔ تاہم مذکورہ علامتیں مناسب ترین آبادی کا کوئی بہت صحیح معیار نہیں بتاتیں۔ وقت اور جگہ کے مطابق آبادی کی "مناسب ترین" تعداد بدلتی رہتی ہے۔ شمال مغربی یورپ کے ممالک مناسب ترین آبادی کی حد تک پہنچ چکے ہیں لیکن کچھ ملکوں (مثلاً نیدرلینڈس) میں اب بھی زیادہ آبادی کے عناصر ملتے ہیں [11]

اشتراکیت پسند مفکرین بھی مناسب ترین آبادی کے تصور کو مالتھیوس کے مفروضے کی طرح دیکھتے ہیں اور ان کا بھی کہنا ہے کہ سماجی اور اقتصادی حالات اتنے زیادہ متحرک ہیں کہ آبادی کی کوئی مناسب ترین تعداد دریافت نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال ریاستہائے متحدہ اور یورپی ملکوں میں مناسب ترین آبادی کے تصور کے بارے میں کافی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔

زائد آبادی ـــــ "زائد آبادی" کا عنصر ان علاقوں میں پایا جاتا ہے جہاں آبادی حقیقی یا امکانی وسائل سے تجاوز کر جاتی ہے۔ آبادی میں مثبت اضافہ، وسائل میں کمی اور درکار مزدوروں کی کمی، چند ایسے محرکات ہیں جن کے اجتماعی یا انفرادی اثر سے زائد آبادی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں زائد آبادی ان ملکوں یا خطوں میں ہوتی ہے جہاں وسائل اور آبادی کے اضافوں میں تال نہیں ہوتا اور جہاں کی آبادی تکنیکی ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہاں "مطلق" زائد آبادی اور "تناسبی" زائد آبادی میں فرق کرنا ضروری ہے۔ "مطلق" زائد آبادی کا عنصر اس وقت رونما ہوتا ہے جب وسائل کی پیداوار اپنے عروج کو پہنچ چکی ہوتی ہے اور پھر بھی معیار زندگی پست ہوتا ہے۔ "تناسبی" زیادہ آبادی وہ ہے جس کے وسائل کم تو ہوں مگر ان میں اضافے کے امکانات ہوں۔ دنیا میں "مطلق" زائد آبادی کی مثالیں بہت کم

ملتی ہیں۔

عام طور پر زائد آبادی کا مطالعہ دیہی، صنعتی، علاقائی یا ملکی سطح پر کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ کسی بھی سطح پر ممکن ہے۔ دیہی زائد آبادی زیادہ تر ترقی پذیر ملکوں میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جنوب مشرقی ایشیا میں، جہاں شرح پیدائش زیادہ ہے، اور شرح اموات دن بدن کم ہورہی ہے۔ زائد آبادی کو وجود میں لانے کے مندرجہ محرکات ہوسکتے ہیں [12] (1) زمینی جائداد کا ٹکڑوں میں منقسم ہونا۔ (2) کسانوں کے درمیان زمین کی تقسیم میں عدم توازن۔ (3) مشینوں کے استعمال میں اضافہ اور زرعی مزدوروں کی مانگ میں کمی۔ (4) کھیتی کے ساتھ مویشی پالنے کے کام میں اضافہ اور زرعی مزدوروں کی مانگ میں مزید کمی۔ (5) دیہی آبادی میں اضافے کی تیز رفتاری۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کسی بھی سطح پر زائد آبادی سماج کے نچلے طبقے کو متاثر کرتی ہے۔ دیہی زائد آبادی میں وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے پاس زمین بالکل نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔ صنعتی زائد آبادی میں غیر ہنرمند یا کم ہنرمند مزدور متاثر ہوتے ہیں۔ اشتراکیت پسند مفکرین زائد آبادی کو سرمایہ دارانہ نظام کی خامی بتاتے ہیں۔ دوسری جانب سرمایہ دارانہ نظام کے حامیوں کا کہنا ہے کہ زائد آبادی کا عنصر کسی بھی سیاسی نظام میں واقع ہوسکتا ہے اور مثال کے طور پر وہ چین جیسے ملک کو پیش کرتے ہیں۔

بیشترین آبادی ــــ "بیش ترین آبادی" کا تصور یہ ہے کہ وہ موجودہ وسائل کے بالکل مطابق ہو۔ اور اگر اس آبادی میں مزید اضافہ ہو تو وسائل ضروریات زندگی کو پورا نہ کرسکیں اور زندگی کا معیار کم ہوجائے اور شرح اموات میں اضافہ ہوجائے۔ مطلق یا بالکل صحیح بیش ترین آبادی جدید عالمی اقتصادی نظام میں تقریباً ناممکن ہے۔ اس کا تصور صرف گزر اوقات کرنے والی ابتدائی معاشیات میں کیا جاسکتا ہے لہٰذا دنیا کی بیش ترین آبادی کے بارے میں اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ شاید "تناسبی" بیش ترین آبادی ایک زیادہ بہتر تصور ہے۔ یہ تصور اٹلی اور آئرلینڈ میں بروئے کار لایا گیا تھا اور وہاں آبادی کی تناسبی بیش ترین تعداد معلوم کرنے کے بعد مہاجرت کے ذریعے آبادی کے دباؤ کو کم کیا گیا تھا [13]

کم آبادی ــــ کم آبادی کا عنصر وہاں رونما ہوسکتا ہے جہاں آبادی اتنی کم ہو کہ موجودہ وسائل کا پوری طرح استعمال نہ ہوسکے، یا جہاں کے وسائل زندگی کے معیار میں کمی لائے بغیر

زیادہ آبادی کی پرورش کرسکیں۔ مطلق کم آبادی ایک نادر چیز ہے لیکن "تناسبی" کم آبادی کی مثالیں عام طور پر، خصوصاً دنیا کے جنوبی خطوں میں، ملتی ہیں۔

کم آبادی کی کیفیت اس جگہ مل سکتی ہے جہاں زندگی کا معیار اونچا ہو اور بڑے پیمانے پر زراعت کی جاتی ہو۔ اس کی مثالیں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بعض حصوں میں ملتی ہیں۔ کم آبادی کی ایک وجہ تکنیکی ترقی میں کمی بھی ہے، جس کی مثالیں خشک خطوں کے خانہ بدوش گلہ بانوں میں ملتی ہیں۔

کم ترین آبادی ___ انفرادی چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا خطوں میں آبادی کی کم ترین تعداد کا مطالعہ ایک دلچسپ امر ہے۔ ہم یہ مطالعہ جزیروں، پہاڑوں کی وادیوں، گرم سیر جنگلوں، ریگستانوں، مرغزاروں، منجمد خطوں یا اس قسم کے دوسرے علاقوں کی آبادی کے بارے میں کر سکتے ہیں۔ یہاں آبادی کی حیاتیاتی کم ترین تعداد اور اقتصادی کم ترین تعداد میں فرق کرنا ضروری ہے۔ حیاتیاتی کم ترین تعداد افزائشِ نسل کی معیّنہ شرح کو برقرار رکھنے کے لیے افراد کی سب سے کم تعداد ہوتی ہے۔ اقتصادی اعتبار سے آبادی کی کم ترین تعداد وہ ہے جس میں مزید کمی ہونے پر مخصوص اقتصادی شعبوں میں کام رک جانے کا امکان ہوتا ہے۔

مذکورہ تمام خیالات کا مطالعہ عام طور پر بڑھتی ہوئی آبادی اور وسائل کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ سبھی طلبا اور ماہرین کی رائے ایک جیسی نہیں ہے۔ اس اختلاف کی وجہ مختلف سیاسی اور سماجی نظریے ہیں۔ مال تھیوس کے ہم خیال افراد آبادی میں اضافے کو بہت بڑا خطرہ بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس خطرے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر آج کی دنیا میں پیدائش کے مقابلے میں موت پر زیادہ قابو پایا جارہا ہے۔ پچھڑے ملکوں میں سماجی تنظیم ایسی ہے جس سے آبادی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اضافے کی موجودہ شرح کے مطابق کچھ عرصے کے بعد دنیا میں ایشیائی لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوجائے گی کہ ہر جگہ وہی چھا جائیں گے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ جو آج بھوکے ہیں تعداد میں اور زیادہ ہوجائیں گے۔ زندگی کا معیار اور پست ہوجائے گا۔ غریب اور امیر ملکوں کے درمیان دوری بڑھتی جائے گی۔ دنیا کے غذائی وسائل آبادی میں اضافے کے ہم قدم نہیں چل سکیں گے۔ دنیا کے وسیع منفی خطے جن میں پہاڑ، ریگستان، جنگل اور برفیلے علاقے شامل ہیں بڑھتی ہوئی آبادی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیں گے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے غریب اور گنجان آباد ممالک نسل کی

افزائش سے اس درجہ زیر بار ہو جائیں گے کہ مستقبل قریب میں ان کا زندگی کا معیار اونچا نہیں ہو سکے گا۔

دوسری طرف بہت سے مفکرین ایسے ہیں جو مذکورہ خطروں کو بہت شدید نہیں سمجھتے۔ اور موجودہ صورت حال کا الزام سماجی نظام پر لگاتے ہیں۔ کچھ نوآبادیاتی نظام کو برا بتاتے ہیں۔ چنانچہ عمرانیات کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ ماہرین سماجی اور اقتصادی انقلاب پر زور دیتے ہیں تاکہ پیدائش کی شرح کم کی جا سکے اور زندگی کا معیار اونچا کیا جا سکے۔ بہرحال خیالات مختلف ہیں اور اختلافات کی وجوہ دنیا میں آبادی کی ناہموار تقسیم، سیاسی اعتبار سے دنیا کے ٹکڑے، قدرتی وسائل کی ناہموار تقسیم تکنیکی اور ہنرمندی نیز زندگی کے معیار میں غیر یکسانیت اور سیاسی نصب العین کے اختلافات ہیں۔ ظاہر ہے کہ آبادی کے مسئلے کا مطالعہ تو عالمی، ملکی اور علاقائی کسی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مسئلہ کا حل صرف ملکی اور علاقائی سطحوں پر ہی ممکن ہے۔

حوالے

(1) ایس، ایچ، کوتز، "پاپولیشن تھیوریز اینڈ دی اکنامک انٹرپریٹیشن"، 1961، لندن، صص 15، 16۔

(2) ڈبلو، ایس، تھامسن اور ڈی، ٹی، لیوس، "پاپولیشن پرابلمز"، پانچویں اشاعت، 1965، نیویارک، ص 15۔

(3) ڈاکٹر ایس، این، اگروال، "آبادی" (ترجمہ)، 1968، نئی دہلی، صص 11، 12۔

(4) ہنری جارج، "پروگریس اینڈ پاورٹی"، 1905، نیویارک، ص 131۔ یہ حوالہ تھامسن اور لیوس کی کتاب (سابقہ حوالہ ۲) ص 45 سے منقول ہے۔

(5) جے، او، ایم، بروننگ اور جے، ڈبلو، ویب، "اے جاگرفی آف مین کائنڈ"، 1968، نیویارک ص 482۔

(6) سابقہ حوالہ ۱، ص 17۔

(7) سابقہ حوالہ ۱، صص 3-6۔

(8) سابقہ حوالہ ۱، صص 180، 181۔

(9) جوزیف ایس، ڈیوس، "پاپولیشن اپ سرج ان یونائیٹڈ اسٹیٹس"، 1949، ص 37۔
یہ حوالہ کونز کی کتاب (سابقہ حوالہ عـ1) ص 6 سے منقول ہے۔

(10) ایس، این، اگروالا، "انڈیاز پاپولیشن پرابلمز"، نئی دہلی، 1974 پانچواں باب۔

(11) جان آئی، کلارک، "پاپولیشن جاگرفی"، آکسفورڈ، 1965 ص 154۔

سابقہ حوالہ عـ11، ص 155۔

سابقہ حوالہ عـ11، ص 156۔

باب 3

دنیا کی آبادی اور ہندوستان کا مقام

اس وقت پوری دنیا کی آبادی چار ارب سے زیادہ ہے۔ 1971 میں یہ 3 ارب 70 کروڑ تھی۔ دنیا کی آبادی میں تقریباً 2 فی صدی سالانہ شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت سے علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کی آبادی میں اضافے کی رفتار اس سے بھی زیادہ ہے۔ ٹراپکی ملکوں میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جہاں کی آبادی میں اضافے کی شرح 3 فی صدی سالانہ سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف یورپ کے زیادہ تر ملکوں کی آبادی میں سالانہ اضافے کی شرح ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔ اگر دنیا کی آبادی میں مجموعی اضافہ اسی رفتار سے ہوتا رہا تو 35 سال بعد دنیا کی آبادی موجودہ آبادی کی دگنی ہو جائے گی۔

آبادی کی تاریخ ــــ مختلف اثری اور انسانیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کرۂ زمین پر سب سے پہلا انسان عیسیٰ سے تقریباً 6 لاکھ سال پہلے وجود میں آیا ہوگا۔ اندازہ ہے کہ اس وقت سے اب تک تقریباً 78 ارب افراد دنیا میں پیدا ہو چکے ہیں، جن میں سے اس وقت تقریباً $4\frac{1}{2}$ فی صدی سے زیادہ لوگ زندہ ہیں [1]۔ شروع شروع میں پیدا ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ عیسیٰ سے 6 لاکھ سال پہلے سے لے کر 6 ہزار سال پہلے تک کا دور ایسا رہا ہے جس میں پیدا ہونے والوں کی کل تعداد اوسطاً صرف 20 ہزار فی سال تھی۔ اس کے بعد 1650 تک پیدائشیں 55 لاکھ فی سال کے حساب سے ہوتی رہیں۔ 1650 اور 1962 کے دوران ہر سال اوسطاً 7 کروڑ 37 لاکھ افراد پیدا ہوئے۔ یہ تعداد 71 - 1962 کے دوران بڑھ کر 11 کروڑ 11 لاکھ ہو گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ پیدائش کے واقعات میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

آبادی کے متعلق معتبر اطلاعات صرف مردم شماری کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ لیکن منظم طور پر مردم شماری کا آغاز پچھلی صدی سے ہی ہوا ہے اور شروع میں صرف محدود خطوں

میں ہی مردم شماری رائج تھی ۔ اس سے پہلے دنیا کی آبادی کے بارے میں کوئی صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں ۔ پھر بھی علوم اثریات اور انسانیات کے ماہرین نے چند اندازے لگائے ہیں ۔ ان کے اندازے خاص طور پر انسان کی ابتدائی اہم ضروریات پر مبنی ہیں ۔ وقت کے ساتھ ساتھ سطح زمین پر ماحول کی تبدیلی، تہذیب و تمدن میں تبدیلی کا انسانی ضروریات میں اضافہ، انسانی زندگی کے تحفظ کے امکان میں اضافہ، اور دوسرے معمولی اور غیر معمولی حالات کا انسان کی زندگی پر اثر، وہ امور ہیں جن کی بنیاد پر زمانۂ ماضی کی آبادی کا قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر عیسیٰ سے 6000 سال پہلے کے زمانے کے بارے میں اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت تقریباً 34 فی صدی سطح زمین انسان کے استعمال میں آگئی تھی ۔ اس زمانے کے ماحول کے مطابق، جب کہ ذریعۂ معاش زمینی اور فطری پیداوار اور شکار پر منحصر تھا، ایک انسان کی پرورش کے لیے پانچ مربع کلومیٹر زمین کافی رہی ہوگی ۔ اس وقت انسان فطری آفتوں کا زیادہ شکار ہوتا ہوگا ۔ اندازے کے مطابق شرح اموات تقریباً 50 فی صدی رہی ہوگی ۔ اسی طرح کچھ ماہرین نے اس قدیم عہد کے بارے میں بھی اندازہ لگایا ہے جب انسان پتھر کے اوزار اور ہتھیار استعمال کرتا تھا ۔ پتھر کے زمانے کے شروع میں (یعنی اب سے تقریباً دس لاکھ سال پہلے) زیادہ تر آبادی براعظم افریقہ میں تھی ۔ اس وقت افراد کی کل تعداد تقریباً ایک لاکھ 25 ہزار تھی ۔ اس عہد کے آخر میں (یعنی اب سے تقریباً 8000 سال پہلے) انسانی آبادی تقریباً پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور افراد کی کل تعداد 53 لاکھ تک پہنچ چکی تھی ۔ عیسیٰ سے تقریباً 5000 سال پہلے ابتدائی زراعت تہذیب کا جزو بن چکی تھی ۔ اس وقت مرکزی میں آبادی کا گھنا پن بہت کم تھا ۔ اوسطاً 25 مربع کلومیٹر میں ایک آدمی رہتا تھا ۔ لیکن پرانی دنیا میں یہ گھنا پن اوسطاً ایک آدمی فی مربع کلومیٹر تھا ۔ اس وقت پوری دنیا کی آبادی تقریباً 8 کروڑ 65 لاکھ تھی ۔

پتھر کے زمانے سے نشاۃ ثانیہ (سولہویں صدی) تک تہذیب مختلف منزلوں سے گزری ۔ اس مدت میں انسان نے زراعت کے ذریعے غذا کی فراہمی کو یقینی تو بنا لیا تھا لیکن قحط سالی اور وبائی بیماریاں اکثر موت کا سبب ہوتی تھیں ۔ مثلاً 1348-50 میں یورپ میں طاعون ایک زبردست وبا کی شکل میں نازل ہوئی تھی اور ایک اندازے کے مطابق اس وبا سے یورپ کی تقریباً 40 فی صدی آبادی موت کی نذر ہو گئی تھی ۔

دورِ جدید میں آبادی میں اضافہ ۔ آبادی کی تاریخ کا جدید دور 1650 سے شروع ہوتا ہے ۔ 1650 سے 1900 تک کے اعداد و شمار کا ایک عالمانہ جائزہ ولکاکس اور کار ساؤنڈرس نے

گوشوارہ نمبر 1

دنیا کی آبادی 1650 سے 1971 تک

(آبادی لاکھوں میں)

سال	والکاکس کا اندازہ [1]	کارسانڈرس کا اندازہ [2]	اقوام متحدہ کا اندازہ [3]
1650	4700	5450	—
1750	6940	7280	—
1800	9190	9060	—
1850	10910	11710	—
1900	15710	16080	—
1920	—	—	18110
1930	—	—	20150
1940	—	—	22490
1950	—	—	25100
1960	—	—	29950
1970	—	—	36320
1971	—	—	37060

[1] والٹر ایف، ولکاکس، "اسٹڈیز ان امریکن ڈیموگرافی"، نیویارک، 1940 ص 45۔

[2] اے، ایم، کارسانڈرس، "ورلڈ پاپولیشن"، آکسفورڈ پریس، 1936، 42۔

[3] اقوام متحدہ، "ڈیموگرافک ایئر بک 1961" ص 120 اور "ڈیموگرافک ایئر بک 1971"، ص 111۔

پیش کیا ہے ۔ دونوں ماہرین نے شمالی امریکہ ، لاطینی امریکہ ، یورپ، ایشیا ، افریقہ اور آسٹریلیا کا علاقائی اعتبار سے تخمینہ لگایا ہے ۔ ان تخمینوں میں پہلے چار براعظموں کے اعداد و شمار میں کافی یکسانیت ہے لیکن بعد کے دو براعظموں کے اعداد و شمار کافی مختلف ہیں ۔ بہر حال دونوں تخمینوں کی اپنی اپنی بنیاد ہے ۔ 1920 کی اور اس کے بعد کی دنیا کی آبادی کے تخمینے اقوام متحدہ کے اقتصادی و سماجی امور کے شعبے نے پیش کیے ہیں اور یہ کافی معتبر معلوم ہوتے ہیں ۔

1650 سے 1960 تک، یعنی 310 سال کی مدت میں آبادی چھ گنی ہو گئی ۔ یہ اضافہ حیرت انگیز ہے کیونکہ اس سے پہلے انسانی آبادی میں کبھی اتنا سریع اضافہ نہیں ہوا تھا ۔ اگر اقوام متحدہ کا یہ تخمینہ تسلیم کر لیا جائے کہ عیسوی صدی کے شروعات میں روئے زمین پر موجود افراد کی تعداد 20 اور 30 کروڑ کے درمیان تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ 1600 تک آبادی کو دگنا ہونے میں تقریباً سولہ صدیاں لگ گیئں تھیں ۔ لیکن 1650 کے بعد سے اب تک یعنی صرف سوا تین سو سال میں ، دنیا کی آبادی تین مرتبہ دگنی ہو چکی ہے یعنی 1650 کی آبادی کی آٹھ گنی ۔ 1900 تک اضافہ آبادی میں دنیا کے وہ خطے آگے تھے جنھیں اب صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ کہا جاتا ہے لیکن 1920 کے بعد سے ان خطوں میں سریع اضافہ ہو رہا ہے جو اقتصادی اعتبار سے ترقی پذیر ہیں ۔ اصل میں آبادی کے طرز اضافے میں سترہویں صدی کے وسط سے ہی تبدیلی آنے لگی تھی ۔ اسی وقت سے مختلف سے مختلف سائنسی و تکنیکی دریافتوں نے مغربی ملکوں کے ترقیاتی پہلو کو اجاگر کرنا شروع کر دیا تھا ۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد مغربی ترقی یافتہ ملکوں نے طبی مہارت کے ذریعے موت کی شرح میں خاصی کمی پیدا کر دی تھی ۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ وہاں کے لوگ اس غیر معمولی تبدیلی سے مطابقت بھی پیدا کرتے رہے ۔ لیکن جب یہی طبی دریافتیں ترقی پذیر ملکوں میں پہنچیں تو وہاں انہوں نے حیرت انگیز اثرات پیدا کیے ۔ موت کی شرح میں نمایاں کمی واقع ہوئی لیکن پیدائش کی شرح میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ۔ نتیجے کے طور پر دنیا کی مجموعی آبادی کے اضافے میں اب بھی کوئی کمی ہوتی نظر نہیں آتی ۔

ہندوستان کی آبادی میں اضافہ 1921 کے بعد سے مستقل طور پر مثبت اور نسبتاً زیادہ رہا ہے ۔ سب سے زیادہ نمایاں اضافہ 71-1961 کی دس سالہ مدت میں ہوا ہے ۔ 31-1921 کے درمیان اضافے کی شرح 1.1 فی صدی سالانہ تھی جو 71-1961 میں 2.24 فی صدی سالانہ ہو گئی ہے ۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں اضافے کی شرح عالمی شرح (2 فی صدی سالانہ) سے بھی

گوشوارہ نمبر 2
دنیا کی آبادی میں اضافہ کی شرح

1650 سے 1750 تک	0.3 فی صدی سالانہ
1750 سے 1850 تک	0.5 فی صدی سالانہ
1850 سے 1950 تک	0.8 فی صدی سالانہ
1950 سے 1971 تک	1.9 فی صدی سالانہ

زیادہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر آئندہ چند سالوں میں اضافے کی شرح میں تخفیف نہ ہوئی تو ہندوستان کو اس صف میں کھڑا ہونا پڑے گا جس میں آج لاطینی امریکہ، افریقہ، جنوب مغربی ایشیا اور اوشینیا کے زیادہ تر ممالک نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ہندوستان کے ماہرین عمرانیات کا یہ دعویٰ درست ہے کہ 1971 کے بعد سے ملک کی آبادی میں اضافے کی شرح بتدریج کم ہو رہی ہے تو یہ امر باعث اطمینان ہے۔ رجسٹرار جنرل آف انڈیا کے شعبے کے مطابق سال 1975 میں اضافے کی شرح 2.04 فی صدی تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دفتر مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں 79-1975 کے دوران اضافہ آبادی کی سالانہ شرح 2 فی صدی تھی۔

آبادی کی تقسیم ـــــ دیکھنے میں آتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی اعتبار سے آبادی کی تقسیم یکساں نہیں ہے۔ آبادی کی تقسیم میں ناہمواری کی تصدیق مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ آبادی کی تقسیم کا مطلب اس میں آبادی کا پھیلاؤ ہے۔ یہ تقسیم کل رقبۂ زمین یا اس کے کسی حصے سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس تقسیم کے مختلف معیار ہو سکتے ہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ معیار کچھ بھی ہو زمین کے ایک حصے کی آبادی دوسرے حصے کی آبادی سے مختلف ہوتی ہے۔ دریافت کی تاریخ کے اعتبار سے دنیا کے دو حصے ہیں، ایک پرانی دنیا اور دوسری نئی دنیا۔ 1971 میں دنیا کی کل آبادی کا صرف 14 فی صدی نئی دنیا میں اور باقی 86 فی صدی پرانی دنیا میں رہتا تھا۔ اگر کرۂ زمین کو شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا

کرۂ زمین کے شمالی کرۂ میں 90 فی صدی سے زیادہ آبادی رہتی ہے اور جنوبی کرۂ میں دس فی صدی سے کم۔ دنیا کے تمام عظیم بری خطے بھی آبادی کی تقسیم میں ناہمواری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تین جنوبی بری خطوں (افریقہ، جنوبی امریکہ اور اوشینیا) میں مجموعی آبادی کا صرف 16 فی صدی حصہ ہے۔ اس میں بھی افریقہ میں 9.5 فی صدی، جنوبی امریکہ میں 6 فی صدی اور اوشینیا میں صرف 0.5 فی صدی آبادی ہے۔ شمال میں ایشیا اور یورپ کا بری خطہ 76 فی صدی آبادی کا حامل ہے۔ جب کہ شمالی امریکہ میں دنیا کی کل آبادی کا صرف 8 فی صدی حصہ رہتا ہے۔

دنیا کو اگر عرض بلدی منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان میں بھی آبادی کی تقسیم میں ناہمواریاں ملتی ہیں۔ شمالی منطقہ بارده میں آبادی نہیں کے برابر ہے۔ تعداد کے اعتبار سے 60 ڈگری عرض بلد کے شمال میں دنیا کی کل آبادی کا صرف ایک فی صدی حصہ رہتا ہے۔ 30 اور 60 ڈگریوں کے درمیان تناسب 30 فی صدی ہے خط استوا سے 30 ڈگری شمال تک آبادی تقریباً 60 فی صدی ہے۔ اس میں سے خط استوا سے صرف دس ڈگری تک کے منطقے میں مرکوز آبادی کا تناسب تقریباً 20 فی صدی ہے۔

دنیا کی ساری کی ساری آبادی کرۂ زمین کے خشکی کے علاقوں میں رہتی ہے، لیکن خشکی کے علاقوں کی سمندر سطح سے اونچائی ایک اہم امر ہے۔ زیادہ تر لوگ ہموار میدانی علاقوں میں رہتے ہیں۔ سمندر کی سطح سے اونچائی میں اضافے کے ساتھ ساتھ آبادی کی تقسیم میں فرق ہوتا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 500 میٹر سے کم اونچے علاقوں میں دنیا کی تقریباً 75 فی صدی آبادی رہتی ہے، جب کہ 200 میٹر سے کم اونچائی والے علاقوں میں یہ فی صدی 66 ہے۔ سمندر سے اونچائی کے علاوہ سمندر سے دوری بھی آبادی کی تقسیم میں ناہمواری کا باعث ہوتی ہے۔ دنیا کی تقریباً 75 فی صدی آبادی سمندر سے 1000 کلومیٹر دور تک کے علاقوں میں بستی ہے۔ جب کہ 500 کلومیٹر دور تک کے علاقے تقریباً 67 فی صدی آبادی کے حامل ہیں۔

1971 میں دنیا کی کل آبادی تقریباً 3 ارب 70 کروڑ تھی اور کل رقبہ (قطب جنوب کو چھوڑ کر) تقریباً 13 کروڑ 58 لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔ اس طرح دنیا میں آبادی کا گھنا پن 27 افراد فی مربع کلومیٹر ہے۔ افریقہ اور امریکہ میں آبادی کا گھنا پن بہت کم (صرف 12) ہے اور اس سے بھی کم (2 افراد) اوشینیا میں ہے۔ لیکن باقی خطے کافی گنجان آبادی رکھتے ہیں یورپ اور ایشیا میں آبادی کا گھنا پن 91 افراد فی مربع کلومیٹر ہے، اور اگر روس، جس کی آبادی کا

گھنا پن صرف 11 افراد فی مربع کلومیٹر ہے ان خطوں سے علیحدہ کر دیا جائے تو یورپ کا گھنا پن 94 اور ایشیا کا 76 ہو جاتا ہے۔ یورپ میں مغربی یورپ سب سے زیادہ گنجان آباد ہے جہاں کا فی کلومیٹر گھنا پن 150 افراد ہے۔

آبادی کی تقسیم کا مطالعہ کرنے سے گنجان آبادی کے چار خطے دکھائی دیتے ہیں۔ (1) مغربی اور وسطی یورپ۔ (2) شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل کا وسطی خطہ۔ (3) جنوب وسطی ایشیا۔ اور (4) مشرقی ایشیا۔ ان چار خطوں میں دنیا کی تقریباً 70 فی صدی سے زیادہ آبادی مرکوز ہے۔ یہاں آبادی کا گھنا پن 200 افراد سے زیادہ ہے۔ اگر پورے ملک کو ایک اکائی تسلیم کر لیا جائے تو ان خطوں میں بہت سے ملک ایسے ہیں جن کا گھنا پن ظاہری طور پر 200 افراد سے کم ہے۔ اقوام متحدہ کے تخمینے کے مطابق چند ملکوں میں 1971 کی آبادی کا فی مربع کلومیٹر گھنا پن مندرجہ ذیل تھا:

جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک	148
سوئٹ زرلینڈ	154
ہندوستان	168
سری لنکا	193

اس طرح کے ملکوں میں آبادی کی تقسیم انتہائی ناہموار ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان میں ایسے علاقے شامل ہیں جہاں وسائل کی کمی کے باعث گذر بسر دشوار ہے۔ دوسری طرف جن علاقوں میں حالات سازگار ہیں وہاں آبادی کا گھنا پن بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر، ہندوستان کے مغربی بنگال اور کیرالا صوبوں میں آبادی کا گھنا پن 500 افراد سے زیادہ ہے، جب کہ پورے ملک کا اوسط 168 ہے۔ غیر موزوں علاقوں کی کثرت کی وجہ سے بہت سے ملک غیر متوقع طور پر بہت چھدری آبادی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر روس، برازیل، پیرو اور زائیرے، جن کا گھنا پن 10 اور 11 کے درمیان ہے۔

بعض چھوٹے اور محدود خطوں میں آبادی کا ایک غیر معمولی گھنا پن پایا جاتا ہے۔ اس طرح کی زیادہ تر مثالیں یا تو مذکورہ زیادہ آبادی والے خطوں میں ملتی ہیں یا ان جزیروں میں جہاں رقبہ کے اعتبار سے آبادی کا پھیلاؤ محدود ہے۔ درج ذیل مثالیں جن میں خود مختار ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے شامل ہیں غیر معمولی گھنا پن ظاہر کرتی ہیں:

ڈسٹرکٹ آف کولمبیا	4788	فی مربع کلومیٹر
جبرالٹر	4475	〃
ہانگ کانگ	3912	〃
سنگاپور	3632	〃
دہلی	2738	〃

دنیا کے کچھ خطے ایسے ہیں جو تقریباً بالکل ہی غیر آباد ہیں یا جہاں پر آبادی کا فی کلومیٹر گھنا پن ایک فرد سے کم ہے۔ یہ وہ خطے ہیں جن کا قدرتی ماحول انسان کی رہائش اور گزر بسر کے لیے بہت ہی ناموزوں ہے۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب برف سے ڈھکے علاقے، ہمالیہ جیسے اونچے پہاڑوں پر واقع برفیلے علاقے، وسطی ایشیا کے مانند ناہموار پہاڑی سلسلے اور آمیزن بیسن جیسے دشوار گزار جنگلاتی خطے آبادی کے لیے "منفی علاقے" کہے جا سکتے ہیں۔ جن ملکوں میں منفی علاقوں کا رقبہ زیادہ ہے وہاں آبادی کا گھنا پن بہت ہی کم ہے۔ ذیل کی مثالوں میں کسی بھی ملک کی آبادی 1971 میں دس لاکھ سے کم نہیں تھی اور اگرچہ آسٹریلیا میں تقریباً 3 ا کروڑ تھی تاہم یہ بھی آبادی کے گھنے پن کے اعتبار سے انہیں کم آباد ممالک میں شامل ہے :

نائجر	3	فی مربع کلومیٹر
آسٹریلیا	2	〃
لیبیا	1	〃
منگولیا	1	〃
ماری تینیا	1	〃

پیدائش اور موت ــــ آبادی میں اضافہ اور آبادی کی خصوصیات میں تبدیلی کا انحصار پیدائش اور موت کی شرحوں پر ہے۔ پیدائش اور موت کی شرحوں سے متعلق اعداد و شمار رجسٹریشن کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں۔ دنیا میں کچھ ہی ملک ایسے ہیں جن میں ان اعداد و شمار کے رجسٹریشن کا کام منظم طور سے کیا جاتا ہے اور صحیح اعداد و شمار حاصل کیے جاتے ہیں۔ بہر حال اس وقت مجموعی طور پر دنیا کے بارے خاصی صحیح اطلاعات موجود ہیں۔ تاریخی دور سے پہلے کے ...میں اب بھی کوئی اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ (عمرانیاتی تاریخی دور کا آغاز 1650

گوشوارہ نمبر 3

دنیا میں آبادی کا گھنا پن 1971

گھنا پن افراد فی مربع کلومیٹر

دنیا	27	امریکہ	12
افریقہ	12	شمالی امریکہ	11
مغربی افریقہ	17	وسطی امریکہ	28
مشرقی افریقہ	16	جنوبی امریکہ	12
شمالی افریقہ	10	یورپ	94
وسطی افریقہ	6	مغربی یورپ	150
جنوبی افریقہ	9	جنوبی یورپ	99
ایشیا	76	مشرقی یورپ	106
مشرقی ایشیا	80	شمالی یورپ	50
وسطی جنوبی ایشیا	116	اوشینیا	2
جنوب مشرقی ایشیا	66	آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ	2
جنوب مغربی ایشیا	18	میلانیشیا	5
روس	11	پولی نیشیا اور مائکرونیشیا	42

حوالہ ـــ اقوام متحدہ، "ڈیموگرافک ایئربک 1971"، نیویارک، 1972، ص 111۔

سے ہوتا ہے۔) پھر بھی پیدائش کے واقعات کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ اوسطاً ایک عورت کے یہاں تقریباً 7 سے 10 تک بچے پیدا ہوتے ہیں 4 یہ حقیقی تعداد امکانی تعداد سے یقیناً کم ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں میں بغرض افزائش نسل کی امکانی صلاحیت میں علاقائی طور پر فرق ہوتا ہے لیکن اس بات کی تصدیق ابھی تک نہیں ہو سکی ہے، کیونکہ پیدائش کے واقعات انفرادی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ بہرحال اختلاف کی اصل وجہ زیادہ تر سماجی حالات ہوتے ہیں۔

موت کی شرح کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی سماج میں مختلف ادوار میں حالات یکساں نہیں رہے ہیں۔ اس حقیقت کا اطلاق تاریخی دور سے پہلے کی آبادی پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اندازہ ہے کہ 1650 سے پہلے اموات کے اہم اسباب غذا کی کمی اور وبائی بیماریاں تھیں۔ اس کے علاوہ اتفاقیہ غیر معمولی حالات بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتے تھے۔ 1650 سے پہلے پیدائش کے وقت انسانوں کی زندگی کی اوسط توقع 25 سال یا اس سے کم تھی اور بچپن میں ہونے والی اموات کی شرح تقریباً 30 فی صدی تھی 5 تہذیب و تمدن کی ترقی انسانی زندگی کے تحفظ کے گوناگوں طریقے پیدا کرتی رہی اور اس لحاظ سے ہر سماج میں موت کی شرح بتدریج کم ہوتی رہی۔

دنیا میں تولید کی موجودہ شرح میں بتدریج کمی ہو رہی ہے۔ 1960 میں پیدائش کی سب سے کم شرح (14.3 فی ہزار سالانہ) یورپ کے ملک سوئیڈن میں تھی اور سب سے زیادہ (54.9 فی ہزار سالانہ) افریقہ کے ملک سوڈان میں۔ دس سال بعد سوئیڈن کی شرح پیدائش میں 0.6 اور سوڈان کی شرح پیدائش میں 6.2 کی کمی واقع ہوئی۔ 1970 میں پیدائش کی سب سے کم شرح لکسمبرگ میں (13.2 فی ہزار سالانہ) تھی۔ ان اعداد سے شرح میں بتدریج کمی کا تو اظہار ہوتا ہے لیکن انتہائی شرحوں میں فرق اسی طرح برقرار ہے۔ 1960 میں یہ فرق 40.6 تھا جو 1970 میں گھٹ کر 39.1 ہو گیا تھا۔ اگرچہ دس سال میں انتہائی شرحوں کے فرق میں 1.5 کی تبدیلی ہوئی ہے لیکن تبدیلی کی اس رفتار سے کثیر علاقائی اختلافات کو ہموار ہونے میں برسوں لگیں گے۔

1970 میں شرح پیدائش کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شرح ان ممالک میں کم رہی ہے جو اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ کہے جاتے ہیں۔ سب سے کم پیدائش کی

شرحیں یورپ کے ملکوں میں پائی گئی ہیں۔ یہاں کے شمالی ملکوں میں سویڈن پیش پیش ہے جہاں شرح پیدائش 13.7 فی ہزار تھی۔ 70-1960 کے دوران غیر معمولی تبدیلی کے باعث اب لکسمبرگ میں سب سے کم بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یورپ میں البانیا، آئس لینڈ اور آئرلینڈ کو چھوڑ کر کسی بھی ملک میں پیدائش کی شرح 19 فی ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ آئس لینڈ اور آئرلینڈ کی شرحیں بھی 22 سے کم ہیں۔ البانیا کی عمرانیاتی ساخت ترقی پذیر ملکوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ یورپ کے باہر روس (17.4)، ریاستہائے متحدہ (18.2) اور جاپان (18.8) کی مثالیں اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ پیدائش کی شرح کا تعلق معاشی اور تعلیمی ترقی سے ہے۔ پھر بھی عمرانیات کے کچھ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی ملک عمرانیات کی اس صورت حال کو پہنچ سکتا ہے جو پیدائش میں کمی کے باعث رونما ہوتی ہے۔ اس کے لیے معاشی ترقی، شہری نظام کی ترقی یا تعلیمی ترقی میں زیادتی لازمی نہیں 6

دوسری طرف دنیا کے وہ ملک ہیں جن میں حالات خراب ہیں اور بعض میں تو تشویش ناک حد تک خراب ہیں۔ افریقہ، لاطینی امریکہ اور جنوبی ایشیا کے زیادہ تر ملکوں میں پیدائش کی شرح 35 اور 50 فی ہزار کے درمیان ہے۔ جن ملکوں میں یورپ کے لوگ اب بھی بسے ہوئے ہیں وہاں مجموعی طور پر پیدائش کی شرح کم ہے۔ افریقہ میں سوڈان، نائجر اور زیمبیا، لاطینی امریکہ میں ہونڈوراس اور ایشیا میں پاکستان، سعودی عرب اور انڈونیشیا ایسے مثالی ملک ہیں جن میں دنیا کی سب سے زیادہ شرح پیدائش نوٹ کی گئی ہے۔ اس طرح کے ملکوں میں شرح 48 فی ہزار سے زیادہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان بھی ترقی پذیر ملکوں کے ساتھ جنوبی ایشیا میں واقع ہے لیکن پیدائش کی شرح کے اعتبار سے اس کا شمار اوسط ملکوں میں ہوتا ہے کیونکہ یہاں کی شرح اور مذکورہ ملکوں کی شرح میں تقریباً 8 فی ہزار کا اوسط فرق ہے۔ ہندوستان کے دوسرے ہم پلہ ملکوں میں تھائی لینڈ، لاؤس، گیمبیا اور پیرو شامل ہیں۔ 70-1967 کے دوران ان ملکوں کی شرحیں 3-4 42 فی ہزار رہی ہیں۔

دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں موت کی شرح میں بتدریج کمی ہو رہی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ کمی قدرے نمایاں رہی ہے جس کی وجہ سے ان ملکوں کی آبادی میں اضافے کا مسئلہ اور شدید ہو گیا ہے۔ 71-1965 کے دوران دنیا میں موت کی اوسط شرح 14 فی ہزار سالانہ تھی۔ سب سے زیادہ اموات افریقہ کے مغربی اور وسطی علاقوں میں ہوتی ہیں جہاں پر

موت کی شرح کا اوسط 24 فی ہزار ہے۔ ایشیا کے زیادہ تر ملکوں میں موت کی شرح کا اوسط 15 ۔ 16 فی ہزار ہے ملیشیا کو چھوڑ کر پورا اوشینیا، یورپ، امریکہ اور روس شرح اموات میں یکسانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں 71 - 1965 کے دوران موت کی اوسط شرح 8 اور 11 فی ہزار کے درمیان رہی ہے۔

یورپ کے ملکوں میں موت کی شرح افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کی شرح کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔ 1970 میں زیادہ تر یورپی ملکوں کی شرح اموات 6 اور 13 فی ہزار کے درمیان تھی۔ شرح اموات کے طرز کے لحاظ سے یورپ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے 7 یہ تقسیم سابقہ شرحوں کے مطابق کی گئی ہے۔ اصل میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے موت کی شرح میں علاقائی اختلافات بہت نمایاں تھے۔ مغربی یورپ کے اس حصے میں جس میں برطانیہ، نیدرلینڈز ناروے اور سویڈن شامل ہیں یورپ کے باقی علاقوں کے مقابلے میں کم شرح رہی ہے۔ مغربی یورپ کے ان ممالک میں موجودہ صدی کے شروع سے ہی یہی صورت حال رہی ہے۔ لیکن مغربی یورپ کے دوسرے حصے میں، جس میں آسٹریلیا، بلجیم، لکسمبرگ، شمالی آئرلینڈ اور سوئٹزرلینڈ شامل ہیں، اب بھی شرح اموات نسبتاً زیادہ ہے۔ جنوبی یورپ کے ملکوں میں موت کی شرح پچھلے پچاس سالوں میں بہت کم ہوگئی ہے اور اب یہ ملک مغربی یورپ کی برابری کرنے لگے ہیں، ورنہ یہ وہ خطہ ہے جہاں مشرقی یورپ کو چھوڑ کر پورے یورپ میں سب سے زیادہ اموات ہوتی تھیں۔ مشرقی یورپ، جس میں البانیا، بلغاریہ، چیکوسلوواکیا، ہنگری، پولینڈ، رومانیا اور یوگوسلاویا شامل ہیں، اب اوسط کے برابر ہے۔ 10-1906 کے دوران یہاں موت کی شرح 24.5 فی ہزار تھی جو اس وقت یورپ بھر میں سب سے زیادہ تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے موت کی شرح میں اختلافات کی وجہ زیادہ تر بچپن میں ہونے والی اموات میں زیادتی اور ان کے نمایاں علاقائی اختلافات تھے۔ جنگ کے بعد بچپن میں ہونے والی اموات پر کافی حد تک قابو پالیا گیا ہے اور اب پورا یورپی خطہ یکسانیت کی جانب بڑھ رہا ہے۔

موت کی شرح میں کمی کا طولِ زندگی کے امکان پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے یورپ کے باشندوں کے لیے زیادہ عمر تک زندہ رہنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ سویڈن اس ضمن میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں عورتوں کی اوسط امکانی زندگی 76 سال ہے اور یہی حال ناروے اور نیدرلینڈز میں بھی ہے۔ یورپ کا کوئی [illegible] ایسا نہیں

گوشوارہ نمبر 4

دنیا میں پیدائش اور موت کی شرحیں 71_1965

(فی ہزار سالانہ)

علاقے	پیدائش کی شرح	موت کی شرح
دنیا	34	14
افریقہ	47	21
شمالی امریکہ	18	9
لاطینی امریکہ	38	10
مشرقی ایشیا	31	14
جنوبی ایشیا	44	17
یورپ	17	10
اوشینیا	25	10
روس	18	8

حوالہ ـ اقوام متحدہ، "ڈیموگرافک ایئر بک 1971"، نیویارک، 1972، ص 111 ـ

ہے جس میں امکانی زندگی 60 سال سے کم ہو۔ اقوام متحدہ نے 58-1955 کے اعداد وشمار کے لحاظ سے یورپی ملکوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا تھا اور یہ تقسیم اب بھی درست ہے۔ پہلے گروہ میں البانیا، یونان، پولینڈ، پرتگال، رومانیا، اسپین اور یوگوسلاویا شامل ہیں۔ یہاں امکانی زندگی 60 اور 64 سال کے درمیان۔ دوسرا گروہ آسٹریا، بیلجیم، بلغاریہ، چیکوسلوواکیا، فن لینڈ، جرمنی، ہنگری، آئرلینڈ، اٹلی لکسمبرگ، شمالی آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ پر مشتمل ہے۔ یہاں زندگی کا امکان 65 اور 69 سال کے درمیان ہے۔ تیسرے گروہ میں ڈنمارک، فرانس، نیدرلینڈز، ناروے، سویڈن اور انگلستان شامل ہیں جہاں امکانی زندگی کا اوسط 70 اور 74 سال کے درمیان ہے۔

شرح اموات کے لحاظ سے اوشینیا اور شمالی امریکہ ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ دونوں علاقوں میں سالانہ خام شرح اموات 10 فی ہزار سے کم ہے۔ 1970 میں کناڈا (7.3) آسٹریلیا (8.7) اور نیوزی لینڈ (8.8) میں ریاستہائے متحدہ (9.3) اور میکسیکو (9.9) سے کم شرحیں تھیں۔ تقریباً اس پوری صدی میں موت کی شرحیں کم ہی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر 1900 میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں موت کی اوسط شرح اندازاً 16 فی ہزار تھی اور آسٹریلیا میں 12۔ لیکن اس کے بعد سے بچپن میں ہونے والی اموات میں بتدریج کمی ہوئی جس کی وجہ سے یہ ملک یورپی ملکوں کے برابر آگئے۔ اگر میکسیکو کو اس خطے سے علیحدہ کر دیا جائے تو ان ملکوں کی امکانی زندگی 70 سال سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

1970 میں روس کی خام شرح اموات 8.2 فی ہزار تھی جو دوسرے کئی یورپی ملکوں کی طرح ہے۔ اگرچہ روس کے بارے میں سابقہ شرح اموات کے طرز کے اعداد وشمار موجود نہیں ہیں پھر بھی اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 1917 کے انقلاب کے بعد سے موت کی شرح میں کمی ہوئی ہے۔ انقلاب سے پہلے اندازاً 30 فی ہزار کی شرح سے ہر سال اموات ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد موت کی شرح میں، خاص طور پر بچپن میں واقع ہونے والی اموات کی شرح میں، کمی ہوئی ہے، نتیجے کے طور پر یہاں پیدائش کے وقت زندگی کا امکان ریاستہائے متحدہ میں امکان کے برابر ہے۔ 1938 میں روسی افراد کی امکانی زندگی صرف 47 سال تھی۔ اس طرح روس دنیا کی واحد مثال ہے جہاں اس ضمن میں اتنی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔

لاطینی امریکہ میں حالات بہت مختلف ہیں۔ ایک طرف ہیٹی، بولیویا اور ہونڈوراس

جیسے ممالک ہیں جن میں موت کی خام شرحیں بالترتیب 20، 18 اور 17 ہیں، اور دوسری طرف ارجنٹینا اور یوراگوئے ہیں جن میں موت کی شرحیں یورپی ملکوں کے برابر ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں طبی سہولتوں کی وجہ سے موت کی شرح میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ 1970 میں کچھ ملکوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ملکوں میں موت کی شرح 6 اور 10 کے درمیان تھی جس کا وہاں کی آبادی کے اضافے پر اثر پڑا ہے۔ امکانی طول زندگی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ 1970 میں امکانی زندگی اوسطاً 45 اور 65 کے درمیان تھی۔

افریقہ میں موت کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ موٹے طور پر زیادہ تر ملکوں میں موت کی خام شرح 15 اور 25 کے درمیان ہے۔ 25 سے زیادہ شرح والے ملکوں میں انگولا، گنی، اپر وولٹا اور مالی شامل ہیں جن میں 70 - 1967 کے دوران موت کی خام شرحیں بالترتیب 30.2، 29.9، 29.1 اور 26.6 فی ہزار سالانہ تھیں۔ زیادہ تر ملکوں میں موت کی شرح کم ہو رہی ہے۔ کچھ ملک، مثال کے طور پر مصر اور ماریشس، موت کے امکانات پر قابو پانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں 1971 میں موت کی شرح بالترتیب 12.5 اور 8.0 فی ہزار تھی۔

براعظم ایشیا کو عام طور پر کثیر اموات کا خطہ کہا جاتا ہے لیکن یہاں جاپان، سنگاپور، سری لنکا اور اسرائیل جیسے ملک بھی ہیں جن میں 1970 کی موت کی شرحیں یورپ اور شمالی امریکہ کے ملکوں سے کم تھیں۔ ایشیا میں موت کی خام شرح کا اوسط 15 فی ہزار ہے۔ چین میں شرح اموات اس اوسط کے برابر ہے۔ جن ملکوں میں موت کی شرح مذکورہ اوسط سے زیادہ ہے ان میں افغانستان، نیپال، سعودی عرب اور یمن قابل ذکر ہیں۔ ان ملکوں میں 70 - 1967 کے دوران موت کی شرحیں 22 فی ہزار سالانہ سے زیادہ رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کے تخمینے کے مطابق ہندوستان میں موت کی شرح 16.7 ہے جو 30 - 1921 کے دوران 36 فی ہزار تھی۔ ایشیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں موت کی شرحیں کم ہو رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امکانی زندگی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ایشیائی ملکوں میں امکانی زندگی کی مدت 35 سال سے 75 سال تک ملتی ہے۔ ہندوستان میں 70-1961 کے دوران امکانی زندگی 46 سال تھی۔

بچوں کی اموات ــــ عمرانیات اور آبادیات میں بچوں کی اموات کا مطلب ان

اموات سے ہوتا ہے جن میں ایک سال سے کم عمر کے بچے شامل ہوتے ہیں۔ عام اموات کی شرح پر بچّوں کی اموات کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بچّوں کی اموات کے مطالعے سے کسی بھی مقام کے سماجی ماحول اور عمرانیاتی مستقبل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غذائیت کی کمی، بچّوں کو ہونے والی بیماریوں کی کثرت، طبّی سہولتوں کی قلت اور فی کس کمی آمدنی کی بچّوں کی اموات کے اسباب ہوتے ہیں۔ ان حقائق سے سماجی نظام پر روشنی پڑتی ہے دوسری طرف دیکھا جا سکتا ہے کہ بچوں کی موت کی شرح ان ملکوں میں زیادہ ہوتی ہے جہاں پیدائش کی شرح بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستانی ماہر عمرانیات، ایس، چندر شیکھر، کے مطابق کم ترقی یافتہ سماجوں میں بوڑھے لوگوں کے تحفظ کی کوئی واضح ضمانت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسے سماجوں میں لوگوں کا رجحان بڑھاپے کی تیاری کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ وہ اس طرح سوچتے ہیں کہ ان کے پاس ایک دو لڑکے اُن کے بڑھاپے میں کما کر کھلانے کے لیے ہونے چاہئیں۔ ایسی صورت میں جب بچّوں کے مرجانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے تو احتیاط کے طور پر ایک سے زیادہ اولاد کی خواہش ہوتی ہے تاکہ بڑھاپے تک کوئی نہ کوئی سہارا باقی رہ سکے۔ چندر شیکھر کا خیال ہے کہ اگر پیدائش کی شرح کو کم کرنا ہے تو بچپن میں ہونے والی اموات کو کم کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کا ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا رجحان ختم ہو جائے [8]

بچّوں کی اموات کا مطالعہ کرنے کے لئے شرح اموات کی مدد لی جاتی ہے۔ روایتی طور پر مذکورہ شرح کے واسطے پیدا ہونے والے بچّوں کی مجموعی تعداد اور ایک سال عمر تک کے بچوں میں ہونے والی اموات (طفلی اموات) کی کل تعداد کو تناسب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ طفلی اموات کو شمار کنندہ تسلیم کیا جاتا ہے اور تناسب فی ہزار کے حساب سے معلوم کیا جاتا ہے۔ دنیا میں چند ہی ملک ایسے ہیں جن میں بچوں کی موت سے متعلق معتبر اعداد و شمار حاصل کیے جاتے ہیں۔ بہر حال موجود مواد کے مطابق کئی قابل قدر مطالعے کیے گئے ہیں۔

بیسویں صدی کے گذشتہ تین چوتھائی عرصے میں بچوں کی اموات میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ یہ کمی عالمی سطح پر ہر ملک میں دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ دنیا کے مختلف ممالک اقتصادی، سماجی اور تکنیکی ترقی کی مختلف منزلوں میں ہیں پھر بھی عالمی سطح پر طفلی اموات میں 50 سے 75 فی صدی کی کمی ہوئی ہے۔ بچپن میں ہونے والی اموات کے موجودہ طرز کے لحاظ سے دنیا کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ ان ملکوں کا ہے جس میں بچپن میں

گوشوارہ نمبر 5

دنیا کے منتخب ملکوں میں طفلی اموات کی شرح [1]

(1900 سے 1970 تک)

سال	ہندوستان	جاپان	انگلینڈ اور ویلس	آسٹریلیا	نیوزی لینڈ	سویڈن	ڈنمارک
1900	232	151	154	104	71	94	130
1910	209	160	105	75	56	75	101
1920	195	168	80	66	48	65	91
1930	181	142	60	47	32	60	82
1940	160	124	57	38	30	39	50
1950	127	60	30	24	23	20	31
1960	86	31	22	20	23	17	22
1970	113	13	10	18	17	[2] 12	14

[1] یہاں بچپن میں ہونے والی اموات کا تکنیکی مطلب ان اموات سے ہے جو ایک سال سے کم عمر کے بچوں میں واقع ہوتی ہیں۔ "شرح" بچوں کی اموات فی ہزار زائیدہ بچوں کے حساب سے ایک سال کے لیے معلوم کی گئی ہے۔

[2] 1969 کی شرح۔

حوالہ — (1) ایس، چندر شیکھر، "انفینٹ مارٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا" لندن 1972 ص 105، 354 اور 355۔

(2) اقوام متحدہ، "ڈیموگرافک ایربک 1971" گوشوارہ 28، ص 667-671۔

ہونے والی اموات کی شرح 35 فی ہزار سے کم ہے۔ اس زمرے میں زیادہ تر وہ ممالک ہیں جو اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں۔ دوسرا گروہ 35 اور 75 فی ہزار کی شرح والے ملکوں کا ہے۔ اس میں اٹلی، اسپین اور پرتگال جیسے ترقی یافتہ ملک بھی شامل ہیں اور سری لنکا جیسے ترقی پذیر بھی۔ تیسرا گروہ 75 فی ہزار سے زیادہ شرح کے ممالک کا ہے۔ بہت سے ایشیائی، افریقی اور امریکی ممالک اسی زمرے میں آتے ہیں لیکن ان کے بارے میں اطلاعات بہت کم ہیں۔ ہندوستان بھی اسی تیسرے زمرے میں آتا ہے۔ 70-1966 کے دوران یہاں طفلی اموات کی شرح 113 فی ہزار سالانہ تھی حالانکہ 1901 سے اس شرح میں تقریباً 50 فی صدی کی تخفیف ہوئی ہے۔

عمر اور جنس ـــ پیدائش اور موت زندگی کے وہ اہم واقعات ہیں جن کا آبادی کی خصوصیات پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ آبادی کی فطری خصوصیات عمر اور جنس ہیں۔ عمر اور جنس کے لحاظ سے کسی بھی آبادی کی موجودہ ساخت پیدائش اور موت کی سابقہ شرحوں سے متعین ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں آبادی کی موجودہ ساخت پیدائش اور موت کے امکانی واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دنیا کی تقریباً 45 فی صدی آبادی بیس سال سے کم عمر کے افراد پر مشتمل ہے اور لگ بھگ اتنا ہی تناسب 20 سے 59 سال تک عمر کے لوگوں کا ہے۔ دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کم عمر افراد کا تناسب ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے، لیکن سن رسیدہ افراد ترقی یافتہ ملکوں میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ یکسانیت اگر ہے تو ان جوان لوگوں کے تناسب میں ہے جو 20 سے 44 سال کے درمیان ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں جوان افراد کا تناسب 34.7 اور 34.8 فی صدی بالترتیب ہے۔ افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا کی آبادی "جوان آبادی" کہی جاتی ہے کیونکہ ان ملکوں میں 50 فی صدی سے زیادہ افراد بیس سال سے کم عمر کے ہیں۔ 1960 میں افریقہ میں یہ فی صدی سب سے زیادہ 53.5 تھی۔ ہندوستان کی آبادی میں بھی ترقی پذیر ملکوں کے مانند بچوں اور نوجوانوں کا تناسب زیادہ ہے۔ 1971 میں 20 سال سے کم عمر کے افراد 50.7 فی صدی تھے۔ پھر بھی اس کا شمار دنیا کے ان ملکوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا جن میں بچوں اور نوجوانوں کی تعداد اور تناسب بہت زیادہ ہے۔

کم عمر اور عمر رسیدہ افراد کے تناسب کا بار کفالت پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ دنیا کے وہ تمام ممالک آج اقتصادی اعتبار سے کمزور ہیں جن میں مذکورہ قسم کے افراد کا تناسب زیادہ ہے۔ کم عمر افراد کے تناسب میں انتہا کو پہنچے ہوئے ملکوں میں لاطینی امریکہ کے ممالک ہونڈوراس، کاسٹاریکا اور گوپانا، افریقہ کا ملک سوڈان اور ایشیا کا ملک تائیوان شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اوشینیا اور وسطی امریکہ کے کئی جزیرے کم عمر افراد کے تناسب میں بہت آگے ہیں۔ ان میں سے ہر ملک یا علاقے میں 17 - 16 سال سے کم عمر والوں کی تعداد کل آبادی کے نصف سے زیادہ ہے۔ بار کفالت کا یہ عالم ہے کہ اوسطاً فی کارکن 1.5 افراد کے بار کا حامل ہے۔

دوسری طرف ایسے ممالک ہیں جو معمر افراد کے تناسب میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں فرانس، بیلجیم، انگلینڈ اور ویلس، سویڈن، ناروے، آئرلینڈ، ڈنمارک، مغربی جرمنی، لکثریمبرگ، اسکاٹ لینڈ اور سوئٹزرلینڈ قابل ذکر ہیں۔ ان ملکوں میں ہر دس افراد میں سے ایک فرد یا تو سبک دوش ہو چکا ہے یا سبکدوشی کے قریب ہے۔ 65 سال سے زیادہ عمر کے افراد کا تناسب ان میں سے کسی بھی ملک میں دس فی صدی سے کم نہیں ہے۔ یہ دنیا کے وہ ممالک ہیں جن میں موت اور پیدائش دونوں کی شرحوں میں اور کافی عرصے سے یہ کمی ہوتی چلی آرہی ہے۔ ان ملکوں میں بار کفالت بھی دنیا میں سب سے کم ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ آبادی میں مردوں اور عورتوں کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کم عمر افراد میں مرد زیادہ اور عمر رسیدہ افراد میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ برابر تناسب کے فطری نظام میں علاقائی اعتبار سے اختلافات ممکن ہیں لیکن یہ غیر معمولی حالات میں رونما ہوتے ہیں اور عام طور پر عارضی ہوتے ہیں۔ جنسی تناسب پر اثر انداز ہونے والے تین محرکات ہیں: (1) بچوں کی پیدائش کے وقت جنسی تناسب۔ (2) موت کی شرح میں جنسی تفریق۔ (3) مہاجرین میں جنسی تفریق۔ موت کی شرح ان خطوں میں نسبتاً زیادہ ہے جہاں طبی سہولتوں کی کمی ہے یا طبی سہولتیں بہت مہنگی ہیں۔ اس طرح موت کی شرح اقتصادی نظام سے متاثر ہوتی ہے۔ دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں فی کس طبی سہولتیں اب بھی بہت کم ہیں اس کا سب سے زیادہ اثر

گوشوارہ نمبر 6

عمر کے لحاظ سے دنیا اور بڑے خطوں کی آبادی کی ساخت
(1960)

خطے	معینہ عمر کے زمرے کی فیصدی				
	0 سے 14 تک	0 سے 19 تک	15 سے 59 تک	20 سے 59 تک	60 سے زیادہ
دنیا[1][2][3]	36.2	45.1	56.0	47.1	7.8
مشرقی ایشیا[1]	36.0	45.3	57.1	47.8	6.9
جنوبی ایشیا[2]	40.7	50.5	54.2	44.4	5.1
افریقہ	43.1	53.5	52.3	41.9	4.6
لاطینی امریکہ	41.7	51.6	53.0	43.1	5.3
یورپ	25.8	32.9	59.6	52.5	14.6
سوویت یونین	30.8	37.2	59.5	53.1	9.7
شمالی امریکہ	31.3	38.8	55.7	48.2	13.0
اوشینیا[3]	31.7	39.6	56.9	49.0	11.4

1. شمالی کوریا اور ریوکیو جزیروں کو چھوڑ کر۔
2. اسرائیل اور قبرص کو چھوڑ کر۔
3. پالی نیشیا اور مائکرونیشیا کو چھوڑ کر۔

حوالہ ـــ عالمی آبادی کے ترقی کے امکانات کے بارے میں اقوام متحدہ کی عارضی رپورٹ، نیویارک،
1964 ـ

زچگی کے دوران یا اس کے بعد ہونے والی اموات پر پڑتا ہے۔ اس لیے باوجود اس کے کہ پیدائش کے وقت خواتین کا تناسب زیادہ ہوتا ہے، ترقی پذیر ملکوں میں مائیں زیادہ تعداد میں موت کا شکار ہوتی ہیں اور مجموعی جنسی تناسب میں مردوں کی تعداد زیادہ رہتی ہے [10]
ترقی یافتہ ملکوں کے حالات مختلف ہیں اور وہاں عورتوں کا تناسب زیادہ رہتا ہے۔

جنگ اور مہاجرت کے بھی جنسی تناسب پر نمایاں اثرات دیکھے گئے ہیں۔ جنگ میں کام آنے والے زیادہ تر مرد ہوتے ہیں اور مہاجرت میں بھی جوان مردوں کا تناسب نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ جن علاقوں کی آبادی ان عناصر سے متاثر ہوتی ہے وہاں کا جنسی تناسب غیر متوازن ہو جاتا ہے۔

اگرچہ مردوں کا زیادہ تناسب زیادہ تر ترقی پذیر ملکوں میں ہے تاہم چند ممالک مثلاً آسٹریلیا، آئرلینڈ اور البانیا اور اسی طرح اوشینیا کے بہت سے جزیرے بھی مردوں کے زیادہ تناسب کے حامل ہیں۔ ایشیا میں پاکستان، سری لنکا، سنگاپور جیسے ملکوں میں جنسی تناسب 110 مرد (فی 100 عورتوں) سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف مشرقی جرمنی اور روس جیسے ملکوں میں یہ تناسب 80 کے لگ بھگ ہے۔ ہندوستان کا جنسی تناسب 1971 میں 107 مرد (فی 100 عورتیں) تھا۔

رہائشی تقسیم ــــ رہائش کے اعتبار سے دنیا کی آبادی دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہے یعنی دیہی اور شہری۔ مختلف ملکوں میں دیہی اور شہری علاقوں کی معیاری تعریف مختلف ہے۔ اسی لیے عالمی سطح پر موازنہ مشکل ہے پھر بھی موجودہ اعداد و شمار سے آبادی کی معینہ خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ دیہی آبادی کا زیادہ تر حصہ گاؤں، کھیتی اور دیگر ابتدائی اقتصادی امور سے وابستہ ہوتا ہے جب کہ شہری آبادی میں صنعتی، تجارتی اور انتظامی امور زیادہ تر لوگوں کا پیشہ ہوتے ہیں۔

دنیا میں دیہی آبادی شہری آبادی سے زیادہ ہے لیکن شہری آبادی میں سالانہ اضافہ دیہی آبادی سے تقریباً دگنا ہے۔ عالمی سطح پر رہائشی اعتبار سے آبادی کی تقسیم میں کافی اختلافات ملتے ہیں۔ مغربی اور وسطی یورپ اور شمالی امریکہ دنیا کی شہری آبادی کے سب سے نمایاں نقطے ہیں۔ ان کے برخلاف ایشیا اور وسطی افریقہ کے ملکوں میں دیہی آبادی کی کثرت ہے۔ جنوبی یورپ روس، لاطینی امریکہ، شمالی افریقہ اور اوشینیا

میں دیہی اور شہری آبادی کے تناسبوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ افریقہ میں سب سے زیادہ کا شہری آبادی جنوبی افریقہ میں ہے جہاں 1970 میں 48 فی صدی کا تناسب تھا۔ اس کے علاوہ شمالی افریقہ میں ماری شس (44 فی صدی شہری) کو چھوڑ کر مصر، یٹونیشیا، الجیریا اور مراقش اوسط شہری آبادی کے خطے ہیں، لیکن ان میں کم سے کم 60 فی صدی آبادی اب بھی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ جنوب وسط میں واقع تنزانیہ، روانڈا، برنڈی اور ملاوی کے خطے میں 95 فی صدی سے زیادہ آبادی دیہی ہے۔ یہ تناسب دنیا میں سب سے زیادہ ہے برنڈی میں صرف 2.2 فی صدی افراد شہروں میں رہتے ہیں۔

ایشیا بہت زیادہ دیہی آبادی کا حامل ہے۔ پورے جنوب مشرقی خطے میں 80 فیصدی سے زیادہ آبادی دیہی ہے۔ چین میں یہ تناسب 86.7 ہے۔ کمبوچیا میں تناسب 88.7 فی صدی ہے جو ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں دیہی آبادی کا موجودہ تناسب 80 فی صدی سے کچھ ہی زیادہ ہے جب کہ پچاس سال پہلے یہ تناسب تقریباً 90 تھا۔ جاپان اور اسرائیل ملکوں میں شہری آبادی کے تناسب زیادہ یعنی بالترتیب 82 اور 72 ہیں۔ منگولیا، ترکی اور ایران جیسے ملکوں میں شہری تناسب 35 اور 60 کے درمیان ہے۔

شمالی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا، جنوبی امریکہ میں یوراگوے، وینزویلا اور چلی کثیر شہری آبادی کے ملک ہیں۔ ان میں شہری آبادی 75 فی صدی سے کم نہیں ہے۔ لاطینی امریکہ کے کیوبا اور میکسیکو میں تقریباً 60 فی صدی آبادی شہری علاقوں میں رہتی ہے۔ امریکہ کے نام نہاد دیہی علاقوں میں بھی کم سے کم 30 فی صدی آبادی شہری ہے۔ تقریباً یہی صورتِ حال یورپ میں بھی ہے، جہاں ایک طرف سویڈن اور بیلجیم جیسے کثیر بلدی آبادی کے ملک ہیں یعنی 80 فی صدی سے زائد شہری آبادی رکھتے ہیں، اور دوسری طرف البانیا، مغربی جرمنی اور رومانیا جیسے کثیر دیہی آبادی کے ملک ہیں جو 60 فی صدی سے زائد دیہی آبادی رکھتے ہیں۔ اوشینیا میں آسٹریلیا (85.5 فی صدی شہری) اور نیوزی لینڈ (63.5 فی صدی شہری) کے علاوہ تمام علاقے کثیر دیہی آبادی کے حامل ہیں، جن میں فیجی (66.6 فیصدی دیہی) اور پالی نیشیا (61.9) سے لے کر نیو گنی (95.3) اور نیو ہبری ڈیز (92.5) تک آبادی مختلف تناسبوں میں بٹی ہوئی ہے۔

مہاجرت ـــ انسانی گروہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی ہوتے ہیں۔ آمدورفت آدمی کے لیے ہمیشہ سے ایک فطری چیز رہی ہے۔ کرۂ زمین پر آبادی کی تقسیم کا موجودہ نقشہ بہت حد تک انسانی گروہوں کی منتقلی کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ آبادی میں تبدیلیٔ سکونت (مہاجرت) کا پہلو اتنا ہمہ گیر نہیں ہے جتنا کہ موت اور پیدائش کا، پھر بھی یہ آبادی کا ایک اہم عنصر اور مخصوص حالات میں ایک اہم محرک ہے۔ مہاجرین کچھ منتخب خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے آبادی میں اضافے کے علاوہ انسانی گروہوں کی خصوصیات میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوجایا کرتی ہیں۔

مہاجرت کو آبادی کا ایک اہم عنصر تصور کیا جاتا ہے اس لیے کہ مہاجرت کے ذریعے آبادی کی دوبارہ تقسیم اور توازن عمل میں آتا ہے اور ایک ایسا نظام بن جاتا جس میں کارکنوں کی شکل میں موجود انسانی قوت کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی کارکردگی میں محض تبدیلیٔ سکونت سے اضافہ ہوسکتا ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مہاجرت سے افراد کے سماجی اور فرقہ واری تعلقات میں تال میل اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں [11]

مہاجرت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مہاجرت موسمی یا عارضی یا مستقل ہوسکتی ہے۔ یہ رضاکارانہ، جبری یا کسی منصوبے کے تحت بھی ہوسکتی ہے۔ بیرونی، اندرونی بین اقوامی براعظمی اور بین براعظمی سطحوں پر بھی ہوسکتی ہے۔ مہاجرت اور اس کی تمام قسمیں تین چیزوں پر منحصر ہوتی ہیں: (1) مہاجرت کی مدت۔ (2) مہاجرت سے متاثر ہونے والی دونوں جگہوں کے درمیان دوری۔ (3) مہاجرت سے متاثرہ دونوں جگہوں کی اصلیت، آیا وہ براعظم ہیں، ملک ہیں یا ملک کا کوئی حصہ ہیں [12] اگرچہ ان عناصر کی بنا پر مہاجرتوں کی اقسام بندی سہل اور سادہ نہیں پھر بھی عام طور پر ہم مہاجرت کو دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (1) اندرونی یعنی اندرون ملک اور (2) بیرونی یعنی بین اقوامی۔

تاریخی دور سے قبل اور اس کے شروع میں انسانی نقلِ آبادی کے کئی بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ پہلا واقعہ ایشیائی مرکزِ آبادی کا انتشار ہے۔ اس مرکز سے مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف بڑے پیمانے پر نقلِ آبادی کے واقعات ہوئے۔ یہاں سے منتقل ہونے والوں نے یورپ، امریکہ اور افریقہ میں

سکونت اختیار کی۔ دوسرا اہم واقعہ یورپ سے متعلق ہے جہاں نئی دنیا کی دریافت سے پہلے مہاجرین ہر سمت سے آتے آور آگے راستہ نہ پاکر تھک ہار کر وہیں بستے گئے۔ پھر نئی دنیا کی دریافت کے بعد یورپ سے لاکھوں لوگ امریکہ گئے۔ تیسرا واقعہ امریکہ کی اس کوشش سے وابستہ ہے جس نے نہ صرف یورپ کے افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا بلکہ افریقہ اور ایشیا کے لوگوں کو بھی دعوت دی۔ چوتھا واقعہ افریقہ کی ایک لمبی کہانی ہے جس میں نسبتاً ترقی یافتہ حصوں سے وقتاً فوقتاً بہت سے لالچی یا بلند حوصلہ لوگ آئے جنہوں نے غلاموں کی تجارت میں حصہ لیا یا نوآبادیات قائم کیں۔ آخر میں آسٹریلیا کا تذکرہ ضروری ہے جس نے ایک زمانے میں جنوبی امریکہ کے جنوبی حصے کو آباد کرنے میں کافی مدد دی تھی اور جو اب یورپ سے آنے والے تارکین وطن کا مسکن بنتا جا رہا ہے۔

مذکورہ تاریخی واقعات نے آبادی کی موجودہ تقسیم اور دنیا کی مختلف تہذیبوں پر اتنا نمایاں اثر ڈالا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت اہم ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی نسلی پیچیدگی کا جنم مہاجرت کے ان ہی تاریخی واقعات کے باعث ہوا ہے[15]

1815 کے بعد یورپ میں مہاجرت کی ایک تیز لہر اٹھی جس میں شمال مغربی یورپ کے صنعتی خطوں کی آبادی اور آئرلینڈ کے دیہی خطوں کی آبادی شمالی امریکہ کی جانب گامزن ہوئی۔ اگرچہ مہاجرت کا یہ سلسلہ پوری صدی چلتا رہا تاہم سب سے زیادہ مہاجرت مذکورہ صدی کے آخر میں ہوئی جبکہ یورپ کے دیہی علاقوں پر آبادی کا بار بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ 1825 اور 1920 کے درمیان صرف برطانیہ سے تقریباً 1 کروڑ 70 لاکھ افراد وطن چھوڑ کر چلے گئے تھے، جن میں سے 65 فی صدی ریاستہائے متحدہ، 15 فی صدی کناڈا، 11 فی صدی آسٹریلیا، 5 فی صدی جنوبی افریقہ اور 4 فی صدی دیگر ملکوں میں جا بسے تھے۔ تقریباً اتنے ہی افراد 1880 اور 1914 کے درمیان اٹلی سے نقل وطن کر گئے تھے لیکن ان میں سے صرف ایک تہائی تعداد مستقل مہاجرین کی تھی۔ یورپ میں مہاجرت کا سب سے زیادہ زور 1901 اور 1910 کے درمیان ہوا اس دور میں اٹلی سے جانے والے مہاجرین کی تعداد 59 لاکھ، سلطنت آسٹریا اور ہنگری سے 34 لاکھ، برطانیہ سے 28 لاکھ اور فرانس سے 16 لاکھ تھی۔ سب سے زیادہ مہاجرین ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ 1840 اور 1914 کے درمیان ریاستہائے متحدہ میں پہنچنے والے مہاجرین کی تعداد 5 کروڑ تھی، جس میں سے 4 کروڑ 1880 اور 1914 کے درمیان وہاں پہنچے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں یورپ سے مہاجرین کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا اور اس جنگ کے

بعد حالات بدل جانے کی وجہ سے بین اقوامی مہاجرت بہت اہم نہیں رہ گئی تھی ۔ 1930 کی دہائی میں مغربی یورپ میں مہاجرت نے ایک دوسرا رخ اختیار کیا یعنی اس زمانے میں مغربی یورپ کے فرانس، برطانیہ اور جرمنی جیسے ملکوں نے مہاجرین کی آمد کو بہت زیادہ قبول کیا [14]

دوسری جنگ عظیم کے بعد جبری مہاجرت نے ایک اہم شکل اختیار کر لی تھی ۔ مہاجرین پناہ گزینوں اور جلا وطنوں کی حیثیت سے دوسرے ملکوں میں پہنچنے لگے اگرچہ موجودہ صدی میں جبری مہاجرت بلقانی جنگوں (13 - 1912) کے بعد رونما ہوئی تھی پھر بھی اس طرح کی مہاجرت نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی شدت اختیار کی ۔ 1945 اور 1967 کے درمیان ایشیا میں تقریباً 2 کروڑ 20 لاکھ افراد افریقہ اور ایک لاکھ کے لگ بھگ کیوبا میں پناہ گزینی پر مجبور ہوئے ۔ اگرچہ پناہ گزینوں سے متعلق اعداد و شمار کی صحت میں شبہ رہتا ہے پھر بھی موجودہ اعداد و شمار سے اس مسئلے کی شدت کا احساس ہوتا ہے (گوشوارہ نمبر 7) ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دس سال کے اندر اندر جبری مہاجرت سے پیدا ہونے والے اقتصادی اور سماجی مسائل نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ عالمی سطح پر اس بارے میں غور و خوض لازم ہو گیا ۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ رضا کارانہ بین اقوامی مہاجرین پر بھی پابندیاں عائد کی جانے لگیں ۔ بہر حال 1945 کے بعد سے رضا کارانہ مہاجرت میں بھی کچھ تیزی آئی لیکن رضا کارانہ مہاجرت غیر رضا کارانہ مہاجرت کا تقریباً 6 فی صدی تھی [15]

غرض یہ کہ پناہ گزینوں اور جلاوطنوں نے مہاجرت کا دوبارہ آغاز کیا ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلے سات سالوں میں یورپ سے ترکِ وطن کرنے والے لوگوں کی تعداد 44 لاکھ 52 ہزار تھی جب کہ یورپ میں ترکِ وطن کر کے آنے والے لوگوں کی تعداد 11 لاکھ 50 ہزار تھی ۔ زیادہ تر جانے والے لوگ برطانیہ، جرمنی اور نیدرلینڈس سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے بیشتر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ریاستہائے متحدہ اور کناڈا گئے تھے ۔ اطالوی اور ہسپانوی افراد زیادہ تر جنوبی امریکہ گئے تھے ۔ آسٹریلیا نے خاص طور پر یورپی مہاجرین کو متوجہ کیا ۔ 1947 اور 1961 کے درمیانی وقفے میں تقریباً 15 لاکھ افراد آسٹریلیا کی آبادی میں شامل ہوئے تھے، جن میں 32 فی صدی برطانیہ اور اس کے زیر حکومت علاقوں سے، 27 فی صدی جنوبی یورپ سے، 20 فی صدی مشرقی یورپ سے اور 18 فی صدی شمالی یورپ سے آئے تھے ۔ جرمنی کی تقسیم اور ہندوستان کی تقسیم سے بھی بڑے پیمانے پر نقل آبادی کے واقعات پیش آئے ۔ 1947 میں ہندوستان کی تقسیم

اور پاکستان کی تشکیل کے نتیجے کے طور پر تقریباً ایک کروڑ افراد نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔

گوشوارہ نمبر 7

بین اقوامی پناہ گزین 1968

عظیم بری خطے	کل پناہ گزین	آباد	غیر آباد
افریقہ	850000	500000	350000
ایشیا: مشرق بعید	2450000	750000	1700000
مشرق وسطیٰ (عرب)	900000	—	—
اسرائیل (یہودی)	1000000	1000000	—
امریکہ: شمالی امریکہ	1200000	1300000	—
جنوبی امریکہ	140000	130000	10000
یورپ	1050000	980000	70000
اوشینیا	300000	300000	—

حوالہ۔ جی، بیجر، "ماڈرن پیٹرنس آف انٹرنیشنل مائگریٹری موومنٹس"۔ یہ مقالہ مذکورہ ذیل کتاب میں شائع ہوا۔ جے، اے، جیکسن (مؤلف)، "مائگریشن"، کیمبرج، 1969ء، 19۔

حوالے

(1) اسٹوارٹ منڈ (مولف)، "دی پاپولیشن کرائسیس اینڈ دی یوز آف ورلڈ ریسورسیز"، ص 45۔
اس کتاب میں آنا بیلے ڈیلیس مانٹ نے مضمون "زمین پر کتنے افراد رہ چکے ہیں" کے اندر فلیچر ویلے میر کے تخمینے کو نقل کیا ہے۔ مضمون میں 1962 تک کا تخمینہ دیا گیا ہے۔ 1962 سے 1971 تک کے تخمینے کے لیے اقوام متحدہ کے عمرانیاتی دستاویزوں کا سہارا لیا گیا ہے۔

(2) جی، ٹی، تری وار تھا، "اے جاگرفی آف پاپولیشن، ورلڈ پے ٹرنس"، نیویارک، 1969، ص 7۔
تری وارتھا نے اڈوارڈ ایس، ڈی وی کے تخمینے کا حوالہ دیا ہے۔

(3) ڈی، جے، بوگ، "پرنسپلز آف ڈیموگرافی"، نیویارک، 1969، ص 43۔

(4) ڈبلو، ایس، تھامسن اور ڈی، ٹی، لیوس، "پاپولیشن پرابلمز"، 1965، ہندوستانی اشاعت، ص 385۔

(5) سابقہ حوالہ 3، ص 556۔

(6) سابقہ حوالہ 3، 663-669۔

(7) اقوام متحدہ، "دی سچویشن اینڈ دی ریسنٹ ٹرینڈس آف مارٹیلیٹی ان دی ورلڈ"، پاپولیشن بلیٹن نمبر 6، ص 19۔

(8) ایس، چندر شیکھر، "انفنٹ مارٹیلیٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا"، لندن، 1972، ص 24۔

(9) سابقہ حوالہ 3، ص ص 147-155۔

(10) سابقہ حوالہ 3، ص ص 165، 166۔

(11) جی، بیجر، "ڈیموگرافک، سوشل اینڈ اکنامک آسپیکٹس آف انٹرنل مائگریشن ان سم یوروپین کنٹریز"، مقالہ نمبر 190، یونائٹڈ نیشنس ورلڈ پاپولیشن کانگریس (1965)، بلغراد۔

(12) جان آئی کلارک "پاپولیشن جاگرفی"، آکسفورڈ، 1965، ص 123۔

(13) جے، بیجو گارنیر، "جاگرفی آف پاپولیشن" (انگریزی ترجمہ)، لندن، 1966، ص 167۔

(14) سابقہ حوالہ 12، ص 135۔

(15) جے، اے، جیکسن (مولف) "مائگریشن"، کیمبرج، 1969، ص 23۔

باب 4

ترقی پذیر ممالک کی آبادی

ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت مثبت اور تیز اضافۂ آبادی ہے۔ ہندوستان، جس کی آبادی 66 کروڑ (1979) سے زیادہ ہو چکی ہے، تمام ترقی پذیر ملکوں میں آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ اس کا رقبہ کل دنیا کے رقبے کا 2.4 فی صدی ہے، اور ترقی پذیر ملکوں کے کل رقبے کا 2 .4 فی صدی ہے۔ جہاں تک آبادی کے تناسب کا سوال ہے ہندوستان میں کل ترقی پذیر خطے کی آبادی کا 24.4 فی صدی حصہ بستا ہے۔ ہندوستان کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے اس زمرے کا تذکرہ مناسب ہوگا جس میں ہندوستان شامل ہے۔

عام طور پر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک ترقی یافتہ اور دوسرا ترقی پذیر۔ ترقی پذیر ملکوں کو بسا اوقات "کم ترقی یافتہ" یا "پسماندہ" بھی کہتے ہیں۔ لیکن "ترقی پذیر" اصطلاح یوں موزوں سمجھی جا سکتی ہے کہ ان ملکوں کی معیشت بہر حال متحرک ہے اور عموماً کسی نہ کسی رفتار سے ترقی کی جانب گامزن ہے۔ سیاسی اعتبار سے زیادہ تر ترقی پذیر ممالک عام طور پر غیر جانبدار ہیں۔ چنانچہ ایک طرف سرمایہ دارانہ اور دوسری طرف اشتراکیت پسند ملکوں سے ممیّز کرنے کے لیے غیر جانب دار ملکوں کو "تیسری دنیا" بھی کہتے ہیں۔ بہر حال چونکہ ان ملکوں کی اقتصادی ترقی اور آبادی میں اضافے کے درمیان یکساں رابطہ نہیں پایا جاتا اور ان ملکوں میں ترقی کے امکانات بھی یکساں نہیں ہیں اس لیے قطعی الفاظ میں ترقی پذیر ملکوں کی تعریف بھی آسان نہیں ہے۔ تاہم ان ملکوں میں بعض خصوصیات مشترک ہیں۔ مثلاً پست معیار زندگی، اوسط آمدنی کی پستی، غذا اور صنعتی توانائی کا کم صرفہ، کم اور ناقص غذائیت، تعلیم کی کمی، بے روزگاری اور کم روزگاری، خرابیٔ صحت، آبادی میں تیز اضافہ، آبادی میں کم عمر لوگوں کی کثرت، زرعی آبادی کی کثرت، وسائل کا کم اور ناقص استعمال، محدود سرمایہ اور محدود ساز و سامان، محدود صنعتی نظام، مواصلات اور

نقل وحمل کے ذرائع کی کم مائیگی ۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مذکورہ تمام عناصر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ۔ یہ عناصر مختلف سماجی، اقتصادی اور آبادیاتی محرکات کو جنم دیتے ہیں ۔ اگر ایک عنصر یا محرک بدلتا ہے تو دوسرے کا بدلنا لازم ہے ۔ لہٰذا ان مختلف عناصر کو مجموعی طور پر ایک معیار کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے ۔

بہرحال ترقی پذیر ملکوں کی شناخت کا کوئی معیار بنانے میں ایک بڑی قباحت ہے ۔ وہ یہ کہ ترقی کی بلندی اور پستی کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں، کیونکہ جو ملک ایک شعبے میں ترقی یافتہ ہیں ضروری نہیں کے دوسرے شعبوں میں بھی ویسے ہی ہوں ۔ یہ فرق اس لئے واقع ہوتا ہے کہ ان ملکوں کی اندرونی کیفیت مستحکم نہیں ہوتی ۔ ان حالات میں یہ بات تعجب خیز نہیں کہ مختلف عالموں اور اداروں نے "ترقی پذیر" اور "کم ترقی یافتہ" ملکوں کی شناخت کے لیے اپنے معیار پیش کیے ہیں ۔ تنظیم اقوام متحدہ نے افریقہ میں ریپبلک آف ساؤتھ افریقہ، امریکہ میں کناڈا اور ریاستہائے متحدہ، ایشیا میں جاپان اور ترکی، اوشینیا میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ، اور روس کو چھوڑ کر دیگر تمام ملکوں کو ترقی پذیر تسلیم کیا ہے ۔ لیکن یورپ کی تنظیم اقتصادی تعاون و ترقی (او، ای، سی، ڈی) نے کئی ملکوں (یونان، اسپین، یوگوسلاویا، جبرالٹر، مالٹا اور ترکی) کو بھی اس زمرے میں شامل کیا ہے اور کئی اشتمالیت پسند (کمیونسٹ) ملکوں (چین، شمالی کوریا اور منگولیا) کو، جن کے بارے میں اعداد و شمار آسانی سے مہیا نہیں ہو پاتے، خارج کر دیا ہے ۔ ان دونوں تعریفوں میں سے کسی کو بھی جامع نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ چند ایسے ملک (ارجنٹینا، یوروگوے اور اسرائیل) بھی ہیں جن کو فی الحقیقت ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے مگر اُن کو ان تنظیموں نے فی الحال ترقی پذیر گردانا ہے ۔

سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ "ترقی پذیر" اور "ترقی یافتہ" میں کس طرح فرق کیا جائے ۔ اگر مذکورہ دو درجوں کو نظر انداز کر کے نئے سرے سے زائد درجات کا تعین کیا جائے تو بھی مسئلہ پوری طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا ۔ فرائر نے اقتصادی ترقی کی چار قسمیں بتائی ہیں[1] (1) انتہائی ترقی یافتہ (2) نیم ترقی یافتہ (3) کم ترقی یافتہ ۔ اور (4) منصوبہ بند ۔ رسیٹ نے اقتصادی اور سیاسی ترقی کے پانچ مراحل بیان کیے ہیں[2] (1) روایتی ابتدائی سماج ۔ (2) روایتی تہذیب کا سماج ۔ (3) تغیر پذیر سماج ۔ (4) صنعتی انقلاب کے حامل سماج ۔ اور (5) کثیر صرفہ کرنے والے سماج ۔ یہ دونوں اقسام بندیاں مختلف معیاروں پر منحصر ہیں اور ان میں سے کوئی بھی خامیوں سے خالی نہیں ہے ۔

کلارک نے جاپان اور روس کو چھوڑ کر پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کو ترقی پذیر تسلیم کیا ہے ۔ اس طرح تمام ترقی پذیر ملکوں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً 73 فی صدی ہے جب کہ رقبے کے اعتبار سے یہ ملک صرف 56 فی صدی علاقہ کے مالک ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے یعنی علاقائی ہم آہنگی کے لحاظ سے، ان چند ملکوں کو جو ترقی پذیر ملکوں کے درمیان واقع ہیں لیکن ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں، ترقی یافتہ کے زمرے میں شمار کرنا کچھ بہت معنی خیز نہیں معلوم ہوتا۔

دنیا میں تقریباً 150 ملک ترقی پذیر ہیں جن میں چین، برازیل اور ہندوستان جیسے بڑے بڑے ملک اور ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل ہیں۔ یہ تمام ملک رقبہ، شکل، جائے وقوع، آب وہوا، تہذیب وتمدن، آبادی کا گھناپن، فطری شرح اضافۂ آبادی، پیداوار، غرض کہ ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کچھ ترقی پذیر ملکوں کی آبادی چند ہزار پر مشتمل ہے لیکن دوسرے ایسے ملک بھی ہیں جن کی آبادی کا شمار کروڑوں میں ہوتا ہے۔ ملک کی آبادی کی جسامت ایک ایسی محرک ہے جو آبادی میں اضافے اور اقتصادی ترقی کی رفتار کو یقیناً متاثر کرتی ہے۔ پھر یہ کہ آبادی کی جسامت میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آبادی میں یہ تبدیلی اضافے کی شکل میں ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ اضافہ بہت تیز رفتار سے ہوتا ہے اور اس تیز رفتاری کے باعث ان ملکوں کے اقتصادی مسائل اور دشوار ہوتے جاتے ہیں۔

اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے اقتصادی مسائل میں بہت سے محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں آب وہوائی دشواریاں، نوآبادیاتی نظام، نسلی کمتری، کہنہ سماجی نظام (مثلاً غلامی، جاگیرداری، قبائلی نظام وغیرہ)، غریب اور امیر کے درمیان سماجی ناہمواریاں، متوسط طبقے کی کمی، اور ارضی ملکیت میں اختلافات شامل ہیں۔ اگرچہ مذکورہ تمام محرکات کم ترقی کے اصل اسباب رہے ہیں تاہم ہر ملک اور طبقے کو مختلف حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ ادھر کچھ سالوں میں ترقی پذیر ملکوں کے حالات میں قابل لحاظ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کی اصل وجہ آبادی میں زبردست اضافہ ہے۔ اس سلسلے میں موت کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں یکایک کمی واقع ہونے سے موجودہ حالات سامنے آئے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں طبی ترقی اور امور صحت میں وابستگی رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔ چنانچہ ان ملکوں نے اس ترقی سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے خود کو رفتہ رفتہ حالات کے موافق بھی بنالیا ہے۔ لیکن ترقی پذیر ملکوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ ان

ملکوں نے ترقی یافتہ ملکوں کے مدتوں میں حاصل شدہ علم سے پچھلے چند سالوں سے ہی فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے طریقے اور ذرائع ترقی پذیر ملکوں میں بھی اسی طرح موثر ثابت ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ترقی پذیر ملکوں میں موت کی شرح میں غیر معمولی کمی کا باعث یہی جدید طریقے اور ذرائع تھے، اور اُن کا اثر کم عمر بچوں کی موت شرح پر خاص طور سے پڑا تھا۔ کچھ ملک ایسے ہیں جن میں 40 19 اور 1960 کے درمیان موت کی شرح میں پچاس فی صد کی کمی واقع ہو گئی ہے، اور اب بعض جگہ شرح اموات دس فی ہزار سے بھی کم ہے۔ سری لنکا میں ڈی، ڈی، ٹی کے استعمال سے ملیریا مٹانے کی اسکیم نے دوسری جنگ عظیم کے بعد موت کی شرح 22 سے گھٹا کر 10 فی ہزار کر دی۔ ہانگ کانگ، سنگاپور، ماریشس، تائیوان، کویت، پیورٹو ریکو اور ٹرینی داد جیسے چھوٹے ملکوں اور جزیروں میں موت کی شرح بہت سے ترقی یافتہ ملکوں سے بھی کم ہو گئی ہے اور امکانی زندگی 30 سال سے بڑھ کر 50 سال سے زائد ہو گئی ہے۔ بہر حال ترقی یافتہ ملکوں میں شرح اموات میں ایک سی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ٹراپکی افریقہ کے کچھ ملکوں میں مثلاً گنی، مالی اور اپر وولٹا میں موت کی شرح میں صرف معمولی سی کمی آئی ہے۔

ترقی پذیر ملکوں میں پیدائش کی شرح میں بھی اختلافات ملتے ہیں جن کا سبب سماجی اور حیاتیاتی محرکات ہیں۔ ان ملکوں میں پیدائش کی شرح 30 سے 55 فی ہزار تک ہے جو کہ بہت زیادہ ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پچھلے سالوں میں پیدائش کی شرح میں کمی شاذ و نادر ہی ہوئی ہے۔ نتیجے کے طور پر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کی پیدائش کی شرحوں میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں شرح پیدائش اور اقتصادی ترقی میں کوئی ربط نہیں ہے۔ جن ملکوں میں فی کس آمدنی زیادہ ہے وہاں بھی ضروری نہیں کہ شرح پیدائش کم ہو۔ صرف معتدل لاطینی امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا کے چند چھوٹے ملک (تائیوان، سنگاپور، جنوبی کوریا، ہانگ کانگ اور ملیشیا) وسطی امریکہ اور بحر ہند اور بحر کاہل کے کچھ جزیروں میں ہی پیدائش کی شرح میں واضح کمی ہوئی ہے۔ وینیزویلا ان ملکوں میں سے ہے جہاں پیدائش کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ اضافے کی اصل وجہ کم عمری میں اموات اور مادری اموات کی شرحوں میں کمی، نیز اقتصادی حالات میں بہتری ہیں۔ اسی لیے بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں، بالخصوص وسطی امریکہ میں، شرح پیدائش شرح اموات کی چار گنی ہے۔

پیدائش اور اموات کی شرحوں میں فرق کے باعث آبادی میں فطری اضافے کی شرح 20 فی ہزار

گوشوارہ نمبر 8

ہندوستان اور مختلف خطوں کی آبادی کا تخمینہ 1976

ہندوستان	61 کروڑ 22 لاکھ
ترقی پذیر خطے	2 ارب 98 کروڑ 80 لاکھ
افریقہ	40 کروڑ 60 لاکھ
لاطینی امریکہ	33 کروڑ 70 لاکھ
ایشیا[1]	2 ارب 24 کروڑ 50 لاکھ
ترقی یافتہ خطے	1 ارب 11 کروڑ 80 لاکھ
یورپ	48 کروڑ 20 لاکھ
شمالی امریکہ	24 کروڑ 50 لاکھ
روس	25 کروڑ 80 لاکھ
جاپان	11 کروڑ 10 لاکھ
اوشینیا	2 کروڑ 20 لاکھ
دنیا	4 ارب 10 کروڑ 60 لاکھ

[1] روس اور جاپان کو چھوڑ کر

نوٹ — تخمینے کے لیے ابتدائی اعداد و شمار اقوام متحدہ کی "ڈیموگرافک ایربک 1973" اور حکومت ہند کی "انڈیا 1975" سے ماخوذ ہیں۔

گوشوارہ نمبر 9

دنیا کی آبادی 1750 سے 2000 تک

تعداد لاکھوں میں

	1750	1800	1850	1900	1950	2000
دنیا	791	978	1262	1650	2515	6130
ترقی پذیر خطے	590	731	919	1088	1682	4742
ایشیا[1]	468	600	770	881	1298	3356
افریقہ	106	107	111	133	222	768
لاطینی امریکہ	16	24	38	74	162	638
ترقی یافتہ خطے	201	247	343	562	834	1388
یورپ	125	152	208	296	392	527
روس	42	56	76	134	180	353
شمالی امریکہ	2	7	26	82	166	354
جاپان	30	30	31	44	83	122
اوشینیا	2	2	2	6	13	32

[1] روس اور جاپان کو چھوڑ کر

اضافے کی سالانہ شرح (فی صدی)

	1750 سے 1800 تک	1800 سے 1850 تک	1850 سے 1900 تک	1900 سے 1950 تک	1950 سے 2000 تک
دنیا	0.4	0.5	0.5	0.8	1.8
ترقی پذیر خطے	0.4	0.5	0.3	0.9	2.1
ایشیا[1]	0.5	0.5	0.3	0.8	1.9
افریقہ	0.0	0.1	0.4	1.0	2.5
لاطینی امریکہ	0.8	0.8	1.3	1.6	2.8
ترقی یافتہ خطے	0.4	0.5	1.0	0.8	0.9
یورپ	0.4	0.6	0.7	0.6	0.6
روس	0.6	0.6	1.1	0.6	1.4
شمالی امریکہ	1.1	2.7	2.3	1.4	1.5
جاپان	0.0	0.1	0.7	1.3	0.8
اوشینیا	—	—	—	1.6	1.8

ع1 روس اور جاپان کو چھوڑ کر۔

نوٹ — حوالے کے لیے باب کے آخر میں حوالہ 4 دیکھیے۔

اور بعض جگہوں پر اس سے بھی زیادہ ہے۔ مشرقی ملیشیا میں 70-1965 کے دوران فطری اضافے کی شرح 35.5 فی ہزار تھی۔ 30 فی ہزار سالانہ فطری اضافے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موجودہ آبادی 23 سال میں دگنی ہوجائے گی اور اگر ایک صدی تک اضافے کی شرح یہی رہی تو موجودہ آبادی اٹھارہ گنی ہوجائے گی۔ ایک اندازے کے مطابق برازیل، جس کی آبادی 1966 میں 8 کروڑ 40 لاکھ تھی، 2066 میں 1 ارب 70 کروڑ کا حامل ہوجائے گا کیونکہ یہاں موجودہ آبادی میں فطری اضافہ 3.1 فی صدی فی سال کی شرح سے ہو رہا ہے۔

شرح پیدائش اور شرح اموات کے اختلافات کے نتیجے میں فطری اضافے کی شرحوں میں بھی کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ 70-1960 کے دوران ترقی پذیر ملکوں میں فطری اضافہ آبادی کی شرح کے لحاظ سے مندرجہ ذیل درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ (1) کچھ ترقی پذیر ملکوں میں آبادی کا فطری اضافہ کافی تیز ہے۔ ان ملکوں میں اضافے کی سالانہ شرح 1.5 اور 2.5 فی صدی کے درمیان ہے۔ یہاں پیدائش اور موت دونوں کی شرحیں مسلسل زیادہ رہی ہیں۔ ٹراپکی افریقہ کے زیادہ تر ملک اور لاؤس برما اور ہیٹی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ کچھ افریقی ملک جن میں پیدائش کی شرح 50 فی ہزار سے زیادہ ہے (مثلاً نائجر اور ٹوگو) وہاں فطری اضافے کی شرح 2.5 فی صدی سے تجاوز کر گئی ہے۔ (2) کچھ ترقی پذیر ملک ایسے ہیں جن میں فطری اضافے کی شرح تو 1.5 اور 2.5 فی صدی کے درمیان ہے لیکن اس سریع اضافے کی وجوہ مختلف ہیں۔ ان ملکوں کی آبادی میں فطری اضافہ پیدائش اور موت دونوں کی شرح میں بتدریج کمی کا نتیجہ ہے۔ چین اور ہندوستان کو اس زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ ملک ہیں جن میں خاندانی منصوبہ بندی کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ (3) جن ملکوں میں پیدائش کی شرح مسلسل کم ہورہی ہے اور موت کی شرح پہلے سے ہی خاصی کم ہے وہاں بھی فطری اضافہ 1.5 اور 2.5 فی صدی سالانہ کے درمیان ہے۔ ان کی مثالیں کیوبا، پیورٹو رکو، سنگاپور، ہانگ کانگ اور اسرائیل ہیں۔ (4) ترقی پذیر خطے کے کچھ ملک ایسے ہیں جن میں آبادی کا فطری اضافہ انتہائی سریع کہا جاسکتا ہے۔ تعداد کے اعتبار سے یہاں کی سالانہ شرح 3 فی صدی سے زائد ہے اور یہ صورتِ حال اصل میں پیدائش میں اضافے اور موت میں کمی کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ لاطینی امریکہ کے بہت سے ملک اس زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایشیا، افریقہ، بحر ہند اور بحر کاہل کی کئی چھوٹی ریاستیں بھی اس میں شامل ہیں۔

ترقی پذیر ملکوں کی طبی ترقی کا نتیجہ موت کی شرح میں غیر معمولی کمی کی شکل میں سامنے

آنے لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پیدائش کی شرح میں اضافے کے آثار بھی نمایاں ہیں کیونکہ ان ملکوں کی آبادی میں جوان لوگوں کا تناسب زیادہ ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں 15 سال سے کم عمر کے افراد کا تناسب زیادہ تر 40 اور 50 فی صدی کے درمیان ملتا ہے جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ تناسب 20 اور 33 کے درمیان ہے۔ نکاراگوا، ڈومی نکا اور ہونڈوراس جیسے ملکوں میں بچوں کی تعداد مغربی یورپ کے ملکوں کے مقابلے میں دگنی ہے۔

کم عمر افراد کی زیادہ تعداد بار کفالت میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ لہٰذا ان ملکوں میں بار کفالت کا تناسب بھی زیادہ ہے۔ بار کفالت میں بچوں کے علاوہ بوڑھے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی ضروریات کی تکمیل بھی کمانے والے افراد کرتے ہیں۔ اس طرح غذا، کپڑا اور تعلیم جیسی ابتدائی اور ثانوی ضروریات کی تکمیل کے خاطر ان افراد پر جو کہ خود کفیل نہیں ہیں اور جن میں بوڑھوں کے مقابلے میں بچوں کی تعداد عموماً زیادہ ہوتی ہے، کافی وسائل اور خاصہ سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ اس مسئلے کی نوعیت اس بات سے اور واضح ہو جاتی ہے کہ 1961 میں ہندوستان میں اسکول جانے کے لائق (5 سے 14 سال کی عمر کے) بچوں کی تعداد 11 کروڑ 29 لاکھ تھی۔ دس سال بعد 1971 میں اس تعداد میں تقریباً 50 فی صدی کا اضافہ ہو گیا تھا اور بچوں کی تعداد 15 کروڑ 11 لاکھ ہو گئی تھی۔ یہ اضافہ مسلسل ہوتا رہتا ہے یعنی بچوں کی پرورش اور تعلیم کی اہم ضروریات میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر ترقی پذیر ملکوں کے زیادہ تر نوجوان یا تو ناخواندہ ہیں یا کم تعلیم یافتہ۔ وسائل کی کمی کے باعث بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسکول کی تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے۔ ادھر کچھ سالوں میں چند ملکوں نے تعلیم کو بہتر بنانے کی کوششیں کی ہیں لیکن اب بھی تعلیم کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اس سے سماجی اور اقتصادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں تعلیم یافتہ لوگوں میں اضافے کی رفتار اضافۂ آبادی کی رفتار سے کم ہے۔ ایسے ملکوں میں تعلیم کا مسئلہ مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

ترقی پذیر ملکوں کا اہم ترین مسئلہ وہاں کی آبادی میں تیز اضافہ ہے۔ بڑھتی آبادی کی کفالت کے لیے وہاں کی معیشت ضروری تیز رفتاری سے بڑھنے سے قاصر ہے۔ اگر کسی ملک میں اضافے کی شرح 3 فی صدی سالانہ ہو تو موجودہ اقتصادی حالت کو محض برقرار رکھنے کے لیے کافی قومی سرمائے اور بچت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کے فنز کے مطابق ایسے ملک کی فی کس آمدنی کو صرف برقرار رکھنے کے لیے اپنی قومی آمدنی کا دس فی صدی بچت کھاتے میں ڈالتے

رہنا پڑے گا۔ لیکن ایسا کرنے سے اقتصادی ترقی انتہائی مشکل ہو جائے گی۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کے مالی حالات میں غیر معمولی فرق کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دولتمند ممالک غریب ملکوں کی مالی امداد کریں۔ بدقسمتی سے صرف چند دولتمند ملکوں کو اس بات کا احساس ہے۔ اور توقع یہ کی جاتی ہے ترقی پذیر ملکوں کے عوام خود اپنے آبادی کے مسئلہ اور اقتصادی مسئلوں کی طرف متوجہ ہوں۔

حوالے

(1) ڈی، ڈبلو، فرائر، "ورلڈ اکنامک ڈویلپمنٹ"، 1965۔

(2) بی، ایم، رسیٹ، "ورلڈ ہینڈ بک آف پالیٹیکل اینڈ سوشل انڈی کیٹرز"، 1967۔

(3) جے، آئی، کلارک، "پاپولیشن جاگرفی اینڈ ڈیولپنگ کنٹریز"، 1971۔

(4) گوشوارے کے لیے اعداد و شمار ڈیونڈ کے مقالے "دنیا کی آبادی میں جدید پھیلاؤ" (1967) سے ماخوذ ہیں جس کا حوالہ کلارک نے مذکورہ کتاب (سابقہ حوالہ 3، ص 21) میں دیا ہے۔

باب 5

ہندوستان میں آبادی کی تقسیم

ہندوستان ایک دیہی و زرعی ملک ہے چنانچہ یہاں آبادی کی تقسیم دیہی اور زرعی علامات اور عناصر سے متعین ہوتی ہے ۔ ان عناصر میں زمین کا ڈھال ، مٹی کی خصوصیت اور پانی کی فراہمی اہم مقام رکھتے ہیں۔ مسطح زمین میدانی علاقوں میں ملتی ہے اور ان علاقوں کی مٹی بھی زراعت کے لیے عموماً موزوں ہوتی ہے ۔ میدانی خطوں میں جہاں پانی کی قلت ہوتی ہے ، مختلف طریقوں سے آبیاری کی جاتی ہے ۔ پھر بھی زراعت کے لیے زیادہ تر پانی موسمی بارش سے ہی فراہم ہوتا ہے ۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی زیادہ تر آبادی میدانی حصوں میں ہی بسی ہوئی ہے ۔

طبعی اعتبار سے ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ ایک شمال کا پہاڑی خطہ ، دوسرا گنگا کا بڑا میدان ، اور تیسرا جزیزہ نمائے دکن گنگا کا میدان تقریباً 2400 کلو میٹر لمبا اور 240 سے 320 کلو میٹر تک چوڑا ہے ۔ یہ میدانی علاقہ اصل میں تین دریاؤں یعنی سندھ ، گنگا اور برہم پتر کی وادیوں پر مشتمل ہے ۔ اس عظیم میدانی خطے کی سطح میں کچھ زیادہ نشیب و فراز نہیں ہیں ۔ دہلی سے گنگا کے ڈیلٹا تک 1600 کلو میٹر کی دوری کے باوجود صرف 200 میٹر کا ڈھال ہے ۔ جزیرہ نمائے دکن میں مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ سے متصل ساحلی میدان جو عموماً تنگ ہیں پھیلے ہوئے ہیں ۔ ہندوستان کی آبادی کے 80 فی صدی سے زائد لوگ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور اس دیہی آبادی کا بڑا حصہ میدانوں میں بستا ہے ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے ان نو شہروں میں جن کی آبادی 1971 میں دس لاکھ سے زیادہ تھی سات شہر میدانی علاقوں میں ہی واقع ہیں ۔ خشک اور پہاڑی خطوں اور کم مایہ مٹی کے علاقوں میں آبادی نمایاں طور پر کم ہے ۔

گنگا کے میدان میں آبادی کا گھنا پن مشرق سے مغرب کی طرف کم ہوتا جاتا ہے ۔ چنانچہ میدان کے وسطی اور مغربی علاقوں میں بعض جگہ گھنا پن 400 افراد فی کلو میٹر سے بھی زیادہ ہے جب کہ اوسط گھنا پن 300 اور 400 افراد فی مربع کلو میٹر کے درمیان ہے ۔ گنگا کے اوپری

میدان، یعنی دہلی اور لکھنؤ کے بیچ، گھناپن اور بھی کم یعنی اوسطاً 300 - 300 افراد فی مربع کلو میٹر ہے۔ دہلی کے شمال میں آبادی کا گھناپن 200 سے بھی کم ہے۔ مذکورہ حقائق کی توجیہ آسان نہیں ہے اس لیے کہ آبادی کی تقسیم اور گھناپن میں کئی طبعی محرکات کارفرما رہے ہیں۔ ان میں پانی کی فراہمی اور اس کے نکاس کا بندوبست، مٹی کی خاصیت اور عام طبعی حالت بالواسطہ محرک ہوتے ہیں۔ مشرق سے مغرب کی جانب بارش کی مقدار بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کا گہرا اثر زرعی پیداوار پر پڑتا ہے۔ مغربی بنگال کے ڈیلٹائی علاقے میں سالانہ بارش 150 اور 175 سینٹی میٹر کے درمیان ہوتی ہے۔ گنگا کے وسطی میدان میں یہ مقدار گھٹ کر 100 رہ جاتی ہے۔ گنگا کے اوپری میدان میں سالانہ بارش کا اوسط 60 اور 100 سینٹی میٹر کے درمیان ہے۔ نتیجے کے طور پر اوپری میدان میں، خصوصاً مغربی حصے میں، نیم خشک حالات پائے جاتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے مغرب میں بارش کی کمی کے باعث تقریباً خشک آب و ہوا کا علاقہ ملتا ہے۔

گنگا کا میدان دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بنا ہے۔ اس مٹی کو "الوویم" کہتے ہیں۔ الوویم کی دو قسمیں ہیں، ایک نئی اور دوسری پرانی۔ نئی الوویم عام طور سے زیادہ زرخیز ہوتی ہے کیونکہ اس مٹی میں معدنی اجزا موجود ہوتے ہیں جب کہ پرانی الوویم میں سال بہ سال بارش انہیں بہالے جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال سیلاب کے ذریعے مٹی کی ایک نئی پرت اس مٹی کی زرخیزی تازہ کر دیتی ہے۔ تاہم ان نقصانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو سیلابوں کے ذریعے ان نشیبی علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں نئی الوویم پائی جاتی ہے۔ قدیم الوویم دوآبوں میں نسبتاً اونچی سطح پر ملتی ہے اور سیلاب کی زد سے باہر رہتی ہے۔ بارش کے باعث اس مٹی کے زرخیز اجزا تحلیل ہوکر بہتے رہتے ہیں۔ اسی لیے قدیم الوویم نسبتاً کم زرخیز ہوتی ہے۔ نئی الوویم دھان کی کھیتی کے لیے موزوں ہوتی ہے جب کہ قدیم الوویم کم پیداوری خشک فصلوں کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہے۔ عام طور سے ان خشک دوآبوں میں جہاں گیہوں پیدا کیا جاتا ہے، آبادی سیلابی میدانوں کے مقابلے میں، کم گنجان ہے۔ ان تر علاقوں میں جہاں چاول کی کھیتی کی جاتی ہے آبادی عموماً گھنی ہے۔ گنگا کے دہانے سے جیسے جیسے دوری بڑھتی جاتی ہے نئی الوویم کا رقبہ کم اور قدیم کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا مٹی کی صفت کے اعتبار سے زمین کی عمدگی مشرق سے مغرب کی طرف کم ہوتی جاتی ہے۔[1]

گوشوارہ نمبر 10

ہندوستان کی آبادی کا گھناپن 1971

ہندوستان اور صوبے	رقبہ (ہزار مربع کلومیٹر)	آبادی (لاکھوں میں)	آبادی کا گھناپن (افراد فی مربع کلومیٹر)
ہندوستان	3280	5481	178
کیرالا	39	213	549
مغربی بنگال	88	443	504
بہار	174	564	324
تامل ناڈ	150	412	317
اتر پردیش	294	883	300
پنجاب	50	136	269
ہریانہ	44	100	227
آسام	79	146	186
مہاراشٹر	308	504	164
آندھرا پردیش	227	435	157
کرناٹک	192	293	153
تری پورا	10	16	149
اڑیسہ	156	219	141
گجرات	196	267	136
مدھیہ پردیش	443	417	94
راجستھان	342	258	76
ہماچل پردیش	56	35	62
منی پور	22	11	48

(گوشوارہ نمبر 5 کا بقیہ)

میگھالیہ	22	10	45
ناگالینڈ	17	5	31
سکم	7	2	29
جموں اور کشمیر	222 [ع1]	46	–

مرکز کے زیر انتظام علاقے	رقبہ (ہزار کلو میٹر میں)	آبادی (لاکھوں میں)	آبادی کا گھنا پن (افراد فی مربع کلو میٹر)
دہلی	1.48	41.0	2738
چنڈی گڑھ	0.11	2.6	2257
لکش دیپ	0.03	0.3	994
پانڈی چری	0.48	4.7	958
گوا، دمن اور ڈیو	3.81	8.6	225
دادر اور ناگر حویلی	0.49	0.7	151
مزورام	21.0	3.3	16
انڈمان اور نکوبار جزیرے	8.0	1.1	14
اروناچل پردیش	83.0	4.7	6

ع1 اس میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جو پاکستان اور چین کے غیر قانونی قبضے میں ہے۔

ع2 جموں اور کشمیر اور سکم کو چھوڑ کر۔

حوالہ —— انڈیا 1975، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 7۔

بدلتی ہوئی طبعی خصوصیات کے باعث زرعی عمل بھی بدلتا جاتا ہے اس تبدیلی کا اثر زرعی وسائل پر بھی ہوتا ہے۔ ڈیلٹائی حصے میں تقریباً تین چوتھائی مزروعہ علاقہ دھان کی کھیتی کے لیے مخصوص ہے اور دوسری کم حاصل دینے والی غذائی فصلیں کم مقدار میں اگائی جاتی ہیں۔ دھان کی کھیتی کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا زرعی نظام رائج ہونا مشکل ہے۔ بہر حال چاول کی کثیر پیداوار ہی یہاں کی گنجان آبادی کی غذائی کفالت کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وسطی میدانی حصے میں آب و ہوا کم مرطوب ہے پھر بھی کافی علاقہ زیر کاشت ہے۔ لیکن پانی کی ناکافی مقدار کے باعث دھان کی کھیتی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ کل مزروعہ زمین کا صرف 35 سے 58 فی صدی دھان کی کاشت میں ہے۔ دھان کے علاوہ بہت سی دوسری فصلیں جو آبپاری کے بغیر ممکن ہیں اگائی جاتی ہیں۔ تقریباً 24 فی صدی مزروعہ زمین پر مختلف ذرائع سے آبپاری کی جاتی ہے، لیکن ایسی زمین جس سے سال میں دو فصلیں حاصل کی جاسکیں صرف 15 سے 20 فی صدی ہے۔ بہر حال گنگا کا وسطی میدان بھی تقریباً اتنا ہی گنجان آباد ہے جتنا کہ بارانی ڈیلٹائی خطہ، باوجود اس کے کہ یہاں چاول کی پیداوار نسبتاً کم ہوتی ہے۔ گنگا کے اوپری میدان کی آب و ہوا خشک ہے۔ یہاں چاول کی پیداوار کم ہے اور خاص فصلیں گیہوں، جو اور باجرا ہیں جو کہ نسبتاً کم پیداواری فصلیں ہیں۔ اس کم پیداواری زراعت کی وجہ سے یہاں آبادی کا گھنا پن بھی کم ہے [2]

جزیرہ نمائے دکن کے کناروں پر واقع ساحلی میدانی علاقے بھی اچھی خاصی آبادی کے حامل ہیں۔ مغربی ساحلی پٹی نسبتاً تنگ ہے اور جنوب میں تنگ تر ہوتی جاتی ہے اور پھر بالکل جنوب میں چوڑی ہو جاتی ہے۔ شمال میں گجرات صوبے کا وہ حصہ ہے جسے کاٹھیاواڑ کہتے ہیں۔ یہاں قدیم لاوا چٹانوں پر حالیہ دور کی الوویم پھیلی ہوئی ہے۔ آب و ہوا نیم خشک ہے، یعنی بارش 40 اور 75 سینٹی میٹر کے درمیان ہوتی ہے۔ یہاں تقریباً آدھے سے زیادہ علاقہ زیر کاشت ہے۔ جن جگہوں پر بارش کم ہے وہاں کنووں اور تالابوں سے آبپاری کی جاتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہاں کی آبادی کا گھنا پن لگ بھگ 60 افراد فی مربع کلو میٹر ہے۔ آبادی کی تقسیم یوں ہے کہ جنوب کے تر علاقوں میں زیادہ ہے اور شمال کے خشک علاقے کی طرف گھٹتی جاتی ہے۔

گجرات کے میدان خلیج کھمبات کے نواح میں واقع ہیں۔ الوویم کی ذخیرہ اندازی سے بنے ہوئے یہ میدان تقریباً 400 کلو میٹر لمبے اور 100 کلو میٹر چوڑے ہیں۔ شمال میں واقع

احمد آباد کی سالانہ بارش کا اوسط 73 سینٹی میٹر ہے جو جنوب میں بڑھتے بڑھتے 150 اور 180
سینٹی میٹر تک پہنچ جاتا ہے ۔ آبادی عموماً کافی گنجان ہے ۔ احمد آباد اور بڑودا کے درمیان
گھنا پن 250 سے 320 افراد فی مربع کلو میٹر ہے ۔ یہ علاقہ صنعتی ہے اس لیے اس میں
شہری آبادی کا تناسب لگ بھگ پچاس فی صدی ہے ۔ بالکل جنوب میں ساحلی علاقہ صرف
30 سے 80 کلو میٹر چوڑا ہے اور اس کے بعد میدان بتدریج غائب ہو جاتا ہے اور صرف
نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ رہ جاتا ہے ۔ مجموعی اعتبار سے یہاں آبادی کا گھنا پن اوسطاً 120 سے
160 افراد فی مربع کلو میٹر ہے ۔ ساحلی کناروں پر زیادہ تر بستیاں ماہی گیروں کی ہیں ۔ بمبئی ایک
بڑا شہر ہے اور اس کے نواح میں کئی شہری بستیاں ہیں ۔ اسی طرح گوا کے نواح میں بھی شہری
بستیوں میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ بہر حال، عام طور پر یہاں بستیاں دیہی اور آبادی چھدری ہے 3

میدانی پٹی 14 ڈگری عرض بلد کے بعد جنوب کی سمت میں چوڑی ہوتی چلی گئی ہے،
یہاں تک کہ اس کی چوڑائی تقریباً 70 کلو میٹر ہو جاتی ہے ۔ یہاں آبادی گنجان ہے اور صوبہ کیرالا
میں تو غیر معمولی اور یکساں طور پر گھنی ہے ۔ کیرالا کے جنوبی حصے کی چوڑائی 24 سے 48 کلو میٹر
تک ہے لیکن پال گھاٹ درّے کے قریب اس کی چوڑائی 80 کلو میٹر ہو جاتی ہے ۔ یہاں کا
عمدہ زرعی نظام، جس میں چاول اور ناریل خاص طور سے اہم ہیں، یہاں کی نہایت گنجان آبادی
کی کفالت کرتا ہے ۔ کیرالا کے میدان میں اوسط گھنا پن 400 سے 600 افراد فی مربع کلو میٹر
ہے ۔ مقامی طور پر خالص دیہی علاقوں میں بھی یہ گھنا پن 600 سے 800 تک ہے ۔

جنوبی ہند کے کئی بڑے بڑے دریا مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہیں ۔ مشرقی ساحلی
خطے میں ان دریاؤں نے وسیع ڈیلٹے بنا لیے ہیں ۔ ڈیلٹائی حصوں میں بارش کی کمی کو آبپاشی کے
ذریعے پورا کیا جاتا ہے اور یہی امر یہاں کی گھنی آبادی کا باعث ہے ۔ تین ڈیلٹا تو کافی وسیع
ہیں ۔ سب سے پہلا شمالی ڈیلٹائی میدان ہے جو صوبہ اڑیسہ کے وسط میں واقع ہے اور گھنی آبادی
کا حامل ہے ۔ اس علاقے میں مہاندی، برہمنی اور بیترنی دریا بہتے ہیں ۔ اگرچہ اس علاقے
میں اچھی خاصی سالانہ بارش (150 سینٹی میٹر) ہوتی ہے تاہم یہاں کی 36 فی صدی مزروعہ زمین
پر آبپاری کی جاتی ہے ۔ تقریباً 80 سے 90 فی صدی مزروعہ زمین میں دھان کی کاشت کی جاتی
ہے اور اسی وجہ سے یہاں آبادی کا گھنا پن زیادہ ہے ۔ سب سے زیادہ گنجان علاقے میں
گھنا پن 280 سے 320 افراد فی مربع کلو میٹر ہے ۔ ساحلی کنارے پر وسیع دلدلی اور ریتیلے

علاقے پائے جاتے ہیں جس کے سبب سے زرعی آبادی نسبتاً چھدری ہے۔ آبادی ان علاقوں میں زیادہ مرکوز ہے جو سیلاب کی زد سے محفوظ کر لیے گئے ہیں اور جہاں آبپاری کا معقول انتظام ہے۔ یہاں کی بلدی آبادی ملکی اوسط سے بھی کم ہے۔

دوسرا ڈیلٹائی میدان گوداوری اور کرشنا دریاؤں کا ہے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں بارش کا سالانہ اوسط صرف 90 سینٹی میٹر ہے چنانچہ دھان کی کھیتی کے لیے بارش کے علاوہ دوسرے ذرائع سے پانی کی فراہمی ضروری ہوجاتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہاں پر آبادی کا گھنا پن اڑیسہ کے مہاندی ڈیلٹا سے کچھ ہی کم ہے۔

تیسرا میدان بالکل جنوب میں کاویری دریا کا ڈیلٹائی علاقہ ہے جو کہ آبپاری کے عمدہ نظام کا حامل ہے۔ صوبہ تامل ناڈ کا یہ علاقہ جنوبی ہند کا "اناج گھر" تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں دیہی آبادی کا اوسط گھنا پن 280 افراد فی مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے اور بعض مقامات پر تو 500 سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔

ڈیلٹائی علاقوں کے علاوہ ساحلی میدان کی پٹی میں دیہی آبادی کی تعداد مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ کاویری ڈیلٹا کے شمال میں مدراس تک ساحلی علاقہ یکساں طور پر گھنی آبادی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے آگے کرشنا کے ڈیلٹا تک کے وسیع میدان میں آبادی کا گھنا پن کم ہے۔ یہاں بارش اور آبپاری دونوں کی کمی ہے۔ علاوہ ازیں ریت کے تودے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ساحلی جھیلوں کے باعث مٹی میں کھاری پن زیادہ ہے۔ یہ تمام امور زیادہ پیداوار میں مانع ہیں۔ دریائے گوداوری کے شمال میں ساحلی میدان تنگ ہوتا گیا ہے لیکن آبادی کافی گھنی ہے۔ لیکن مہاندی کے شمال اور مشرق میں گھنا پن کم ہے۔

جزیرہ نمائے دکن کی سطح چٹانی ہے۔ اگرچہ پورے خطے میں ڈھال کہیں بھی بہت زیادہ نہیں ہے تاہم میدانی علاقوں کی کمی اور ناموافق آب و ہوا کے باعث آبادی کا گھنا پن 100 افراد فی مربع کلومیٹر سے کم ہے۔

آزادی کے بعد سب سے پہلی مردم شماری 1951 میں ہوئی تھی۔ اس وقت آبادی کا اوسط گھنا پن 117 افراد فی مربع کلومیٹر تھا جو 1961 میں 138 اور 1971 میں 178 ہو گیا، یعنی بیس سال میں 61 افراد فی مربع کلومیٹر کا اضافہ ہوا۔ سب سے زیادہ (تقریباً دو تہائی)

اضافہ گذشتہ دس سال میں ہوا ہے۔

1951 میں آبادی کا سب سے کم گھنا پن (یعنی 50 افراد سے کم) ہندوستان کے 46 ضلعوں میں تھا۔ 1961 میں ان اضلاع کی تعداد گھٹ کر 31 رہ گئی اور 1971 میں یہ تعداد 23 رہ گئی۔ کم گھنا پن ہندوستان کے ان علاقوں میں ملتا ہے جو اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہیں، مثلاً راجستھان کا ریگستانی علاقہ، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور مہاراشٹر کی جنوبی پہاڑیاں اور پٹھار، کمایوں اور پنجاب کی پہاڑیاں اور مشرقی ہمالیہ کا کچھ حصہ۔ 61-1951 کے دوران مذکورہ علاقوں میں سے وہ جن میں گھنا پن بڑھا تھا وسطی پٹھاری خطے میں واقع تھے۔ اسی طرح 71-1961 کے دوران جن ضلعوں کی آبادی کے گھنے پن میں اضافہ ہوا ان سے واضح ہے کہ پہاڑی علاقوں کے علاوہ باقی تمام علاقوں میں اقتصادی ترقی ہوئی ہے۔ دکن کے پلیٹو پر واقع مدھیہ پردیش میں رائے سین، پنّا اور سرگجا، اڑیسہ کا بدھ کھونڈ ملس ضلع، اور مہاراشٹر میں چندر پور ضلع 1961 تک 50 فی مربع کلومیٹر سے کم آبادی کے حامل تھے۔ 1971 میں ان میں سے ہر ایک کا گھنا پن 55 سے زیادہ ہو گیا تھا۔ راجستھان میں گنگانگر اور چورو میں آبادی کا گھنا پن 50 افراد سے زیادہ ہو گیا ہے۔

سب سے زیادہ گنجان آبادی کے خطے میدانی علاقوں میں واقع ہیں۔ 1951 اور 1961 میں مغربی بنگال کے کلکتہ اور ہوڑا، مہاراشٹر کے گریٹر بمبے، کیرالا کے اِلپّے ضلعوں اور دہلی اور چنڈی گڑھ کے مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقے ملک کے گنجان ترین آباد ضعوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور اب بھی (1971 میں) ان کا وہی مقام ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ان کو 800 سے زائد افراد کے زمرے میں رکھا جاتا تھا لیکن اب انہیں 1200 سے زائد افراد کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ کیرالا کا اِلپّے ضلع، جہاں گھنا پن 1971 میں 1128 تھا، اس زمرے سے مستثنیٰ ہے۔

ہندوستان کی آبادی کے گھنے پن میں سب سے زیادہ علاقائی تبدیلی اوسط اور کم گھنے علاقوں میں ہوئی ہے اور اس کا اثر مجموعی گھنے پن پر پڑا ہے۔ گھنے پن میں علاقائی تبدیلیاں ہو رہی ہیں یا دوسرے الفاظ میں چھدرے آباد علاقے گنجان آباد علاقے ہوتے جا رہے ہیں اور گنجان آباد علاقے گنجان تر۔ 1951 میں ہندوستان کا ایک بڑا حصہ چھدرا آباد تھا۔ اتر پردیش، پنجاب، ہماچل پردیش اور جموں و کشمیر کے پہاڑی اضلاع، راجستھان کا نصف مشرقی حصہ، مدھیہ پردیش، شمال مشرقی

مہاراشٹر، اڑیسہ کا شمالی حصہ، کرناٹک پٹھار اور کاٹھیاواڑ میں آبادی کا گھنا پن 100 ـ 51 کے درمیان تھا - 1961 میں جزیرہ نمائے دکن کے کم گھنے علاقوں میں قابل لحاظ تبدیلی ہوئی خاص طور پر گجرات اور مہاراشٹر صوبوں میں جہاں کم گھنے آباد ضلعوں نے اوسط گھنے پن کا درجہ حاصل کر لیا۔ ایسی ہی تبدیلی اتر پردیش کے بندیل کھنڈ خطے میں بھی ہوئی۔ البتہ شمال مغرب میں واقع پہاڑی ضلعوں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ 1971 میں مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے چند ضلعوں کے علاوہ جزیرہ نمائے دکن کے تقریباً تمام ضلعوں کا گھنا پن 100 سے زائد ہو گیا۔ گھنے پن کی علاقائی تبدیلی میں یہ سب سے بڑی تبدیلی تھی۔ دوسری طرف " سب سے کم آباد اضلاع " کم آباد " ضلعوں میں شامل تو ہوئے لیکن ان کی تعداد صرف آٹھ تھی 5 اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں پورے ملک میں گھنا پن بڑھتا جا رہا ہے وہاں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جن کی آب وہوا اور طبعی بناوٹ اتنی غیر موزوں ہے کہ ان میں گھنا پن اب بھی کم ہی ہے۔

حوالے

(1) جی، ٹی، تری وارتھا، " دی لیس ڈیولپڈ ریلم "، نیویارک، 1972، ص 358 -

(2) سابقہ حوالہ ص 359

(3) دیش پانڈے، " بمبئی کرناٹک کی بستیوں کی قسمیں "، انڈین جاگرفیکل جنرل، جلد 17، 1942، ص 16 -

(4) ڈاکٹر (مس) پی، سین گپتا، " سینسس اٹلس "، سینسس آف انڈیا 1961، جلد اول، حصہ نواں، نئی دہلی، ص 34، 35 -

(5) اے، چندر شیکھر، " پراونشل پاپولیشن ٹوٹلس "، سینسس آف انڈیا 1971، سلسلہ اول، ص 160 - 83 -

باب 6

ہندوستان میں اضافۂ آبادی

ہندوستان دنیا کے ان خطوں میں سے ہے جہاں زمانۂ قدیم سے آبادی کثیر رہی ہے۔ خیال ہے کہ عیسیٰ سے دو صدی پہلے، یعنی اشوک کے زمانے میں، اس برصغیر کی آبادی 10 – 14 کروڑ کے درمیان تھی 1 سمراٹ اشوک کے بعد یہ علاقہ کافی مدت تک ہنگامہ خیز حالات سے دوچار رہا۔ تاہم عیسوی صدی کے شروع میں یہاں کی آبادی تقریباً 7 کروڑ رہی ہوگی 2 اس دور میں گنگا اور سندھ کی وادیاں تہذیب و تمدن اور تکنیکی ترقی کا سرچشمہ تھیں۔ جنوب میں جزیرہ نمائے دکن میں بھی کم و بیش یہی حالات تھے 3 ایک اندازے کے مطابق 1605ء میں ہندوستان کی آبادی دس کروڑ تھی 4 ظاہر ہے کہ عیسوی صدی کے آغاز سے سولھویں صدی کی ابتدا تک آبادی میں بتدریج اضافہ ہوا لیکن اضافے کی رفتار بہت سست رہی۔ اس سست رفتاری کا سبب وہ آفات تھیں جو جنگوں، بیماریوں اور قحطوں کی شکل میں رونما ہوتی رہیں۔

سترہویں صدی کے شروع میں جنوب وسطی ہندوستان کثیر آبادی والے علاقوں میں سے ایک تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں وجے نگر کی ایک ہندو ریاست واقع تھی۔ یہاں تقریباً 3 کروڑ افراد رہتے تھے 5 اس ریاست کے شمال میں کرشنا اور گوداوری دریاؤں کی وادیوں میں کئی مسلم حکومتیں واقع تھیں جن کی آبادی کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ 20 ڈگری عرض بلد کے شمال میں اکبر کی مغلیہ سلطنت تھی۔ یہاں آبادی کی تقسیم انتہائی نامساوی تھی۔ پھر بھی زیادہ تر آبادی گنگا کے اوپری میدان اور سندھ کے اوپری میدان کے مشرقی حصے میں تھی۔ ایک اندازے کے مطابق مشرق میں بنگال سے مغرب میں ملتان تک کا شمالی میدانی علاقہ ½3 کروڑ افراد کا حامل تھا۔ گجرات، بنگال اور کئی مسلم ریاستیں کافی گنجان آبادی رکھتی تھیں۔ اس طرح شمالی ہند اور جنوبی ہند کو ملاکر برصغیر (یعنی موجودہ ہندوستان، پاکستان، بھوٹان، بنگلہ دیش اور سری لنکا) کی کل آبادی 7 – 6 کروڑ تھی 6

اٹھارہویں صدی میں برصغیر کی آبادی کے اضافے میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اس کی وجہ سیاسی اور اقتصادی حالات تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شروع میں آبادی کی اصل تعداد کا صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے، تاہم اس بارے میں سرسری اندازے لگائے گئے ہیں۔ تین مختلف سال یعنی 1750، 1800، اور 1850 لیے گئے ہیں اور ہر سال کے لیے تین اندازے دیے گئے ہیں یعنی کم ترین، اوسط اور بیش ترین۔ کمترین کے اندازے میں غلطی کا امکان "کم" اور بیش ترین کے اندازے میں غلطی کا امکان "زیادہ" ہے۔ اسی طرح، اوسط تعداد میں غلطی کا امکان "اوسط" ہے [7]

	1750	1800	1850
"کم ترین"	16 کروڑ	16 کروڑ	21 کروڑ 50 لاکھ
"اوسط"	19 کروڑ	19 کروڑ 50 لاکھ	23 کروڑ 30 لاکھ
"بیش ترین"	21 کروڑ 40 لاکھ	21 کروڑ 40 لاکھ	24 کروڑ 20 لاکھ

ہندوستان میں سب سے پہلی مردم شماری 72 - 1871 میں ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ مردم شماری نامکمل تھی تاہم اسے بڑی حد تک معتبر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مردم شماری کے مطابق برصغیر کی آبادی 20 کروڑ 60 لاکھ تھی۔ پھر 1881 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی 25 کروڑ 60 لاکھ ہو گئی۔ 1921 تک آبادی میں اضافہ نسبتاً کم اور غیر یکساں رہا لیکن۔ 1921 کے بعد دس سالہ اضافے کی شرح مستقل طور سے مثبت اور نسبتاً زیادہ رہی۔ سب سے زیادہ نمایاں اضافہ 1961 سے 1971 تک کے دس سالہ عرصہ میں ہوا ہے۔ 1921 اور 1931 کے درمیان اضافے کی شرح 11 فی صدی تھی جو 1961 اور 1971 کے دوران 24.8 فی صدی ہو گئی ہے اس زبردست اضافے میں موت کی شرح میں غیر معمولی کمی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ 1921 سے 1971 تک پچاس سال کے وقفے میں موت کی شرح 36 فی ہزار سے گھٹ کر صرف 18 فی ہزار رہ گئی ہے۔ اموات میں کمی ان ہلاکت آفریں قحطوں، بیماریوں اور اس طرح کی دوسری آفات میں کمی کی بنا پر ہوئی ہے جن پر انسان کو زیادہ قدرت حاصل نہیں تھی۔ 1961 اور 1971 کے دس سالہ عرصہ میں شرح اضافہ (2.24 فی صدی فی سال) دنیا کے شرح اضافے (2 فی صدی فی سال) سے تجاوز کر گیا ہے۔ موجودہ شرح کے لحاظ سے ہندوستان کی آبادی میں ہر سال ایک کروڑ 50 لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ تعداد آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی کل آبادی کے برابر ہے، جب کہ آسٹریلیا ہندوستان سے تقریباً ڈھائی گنا بڑا ملک ہے۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں آبادی میں اضافے کی شرح میں بہت زیادہ غیر یکسانیت رہی ہے۔ 1891 سے 1921 تک کے تیس سال کے عرصہ میں اضافۂ آبادی میں کافی علاقائی اختلاف رہا۔ اس کے بعد 61 - 1921 کے عرصہ میں اضافے کی شرح میں کچھ ٹھہراؤ سا آگیا۔[9] مشرق میں آسام اور مغربی بنگال، مغرب میں گجرات اور راجستھان، وسطی ہند میں مدھیہ پردیش اور جنوب میں مہاراشٹر اور کیرالا وہ صوبے ہیں جن میں آبادی کا اضافہ ہندوستان کے اوسط سے زیادہ رہا ہے۔ جموں اور کشمیر میں 71 - 1961 میں جو اضافہ ہوا وہ کافی قابل لحاظ ہے۔ مذکورہ دس سالوں میں اضافے کی شرح 27.79 فی صدی تھی جو سابقہ دس سالہ کی شرح کی دگنی تھی۔ تاہم 1901 سے 1971 تک کے عرصہ میں ملکی شرح کے مقابلے میں یہ شرح کم ہے۔

1901 سے 1971 تک یعنی ستر سالوں میں ہندوستان کی آبادی دگنی (129.93 فی صدی) ہو چکی ہے۔ آبادی کے دس سالہ اضافے کی شرح 1921 کے بعد سے مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ان چھوٹی ریاستوں کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو حال ہی میں صوبے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے تو صوبائی سطح پر آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ (233.82 فی صدی) کیرالا میں ہوا ہے اور سب سے کم (79.60 فی صدی) پنجاب میں۔ دیہی آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ (313.67 فی صدی) آسام اور میزورام میں ہوا ہے اور سب سے کم اضافہ (56.35 فی صدی) پنجاب میں ہوا ہے۔ شہری علاقوں میں بھی آسام اور میزورام کو تمام صوبوں پر سبقت حاصل رہی ہے اس لیے کہ یہاں اضافہ 1621.78 فی صدی تھا اس کے مقابلے میں اتر پردیش میں سب سے کم اضافہ (129.82 فی صدی) تھا[9]

1921 ہندوستان کی آبادی میں شرحِ اضافۂ آبادی کے اعتبار سے ایک تاریخی سال ہے۔ اس سال سے پہلے مثبت اضافہ بہت کم ہوا تھا بلکہ کچھ علاقوں میں منفی اضافہ بھی ہوا تھا۔ 1921 سے پہلے بیس سال کے عرصے میں پورے ملک کی آبادی میں اضافہ 5.42 فی صدی (0.27 فی صدی سالانہ) ہوا تھا۔ پہلی دہائی یعنی 11 - 1901 کے دوران تو اضافہ مثبت (5.75 فی صدی) تھا۔ لیکن 21 - 1911 کے دوران اضافہ منفی (-0.31 فی صدی) تھا۔ ان دونوں دہائیوں میں کم اضافے کی وجہ قدرتی وبائیں مثلاً خشک سالی، قحط اور بیماریاں تھیں[10] 1901 میں پلیگ سے مرنے والوں کی تعداد 25 لاکھ تھی اور ملیریا سے مرنے والوں کی تعداد 1907 میں 13 لاکھ اور 1908 میں 20 لاکھ تھی۔

گوشوارہ نمبر 11

ہندوستان اور برصغیر کی آبادی میں اضافہ

1901 سے 1971 تک

سال	آبادی کروڑوں میں		ہندوستان کی آبادی میں اضافہ (کروڑوں میں)	دس سالہ تبدیلی (فی صدی میں)
	برصغیر	ہندوستان		
1901	29	23.83	—	—
1911	30	25.20	1.37	5.7
1921	31	25.12	0.08 -	0.3 -
1931	34	27.89	2.77	11.0
1941	39	31.85	3.96	14.2
1951	43	36.10	4.25	13.3
1961	53	43.91	7.81	21.6
1971	69	54.79	10.88	24.8

حوالے — (1) انڈیا 1976، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 64 -

(2) کنگس لے ڈیوس، پاپولیشن آف انڈیا اینڈ پاکستان"، پرنسٹن، 1951، ص 27 -

گوشوارہ نمبر 12

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی آبادی میں اضافے کی شرح فی صدی

صوبے	1941-51	1951-61	1961-71	1901-71
آندھرا پردیش	14.02	15.65	20.84	127.77
آسام	19.28	34.45	35.22	342.49
بہار	10.28	19.78	21.56	106.58
گجرات	18.69	26.88	29.39	193.43
جموں وکشمیر	10.42	9.44	27.79	119.08
کرناٹک	19.36	21.57	24.17	123.67
کیرالا	22.82	24.76	26.04	232.82
مدھیہ پردیش	8.67	24.17	28.71	146.72
مہاراشٹر	19.27	36.60	27.26	159.78
اڑیسہ	6.38	19.82	25.14	112.62
پنجاب[1]	0.21	25.86	26.00	95.03
راجستھان	15.20	26.26	27.70	150.43
اتر پردیش	11.80	16.66	19.65	81.72
مغربی بنگال	13.22	32.79	26.94	162.12
تامل ناڈو	14.66	11.85	22.26	113.45
ہندوستان	13.31	21.60	24.80	129.93

ع[1] ہریانہ شامل ہے۔

حوالے ـــ (1) سینسس آف انڈیا، 1971 ـــ آبادی کا تبدیلی، پرچہ نمبر 1 آف 1971۔

(2) انڈیا 1975 حکومت ہند، نئی دہلی، ص 6۔

(آخری کالم میں اضافہ "انڈیا 1975" کے اعداد وشمار کے مطابق ہے۔)

21 - 1901 کے دوران ہندوستان کے تقریباً دو تہائی علاقے میں آبادی میں کمی واقع ہوئی۔ ملک کے اس دو تہائی علاقے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے : (1) گنگا کے میدان سے مہاندی کے ڈیلٹا تک کا علاقہ ۔ (2) راجستھان کے ریگستانی میدان کا حصہ ۔ (3) پنجاب کا میدان اور (4) مہاراشٹر میں اوپری گوداوری ، کرشنا اور تنگ بھدرا دریاؤں کی وادیاں اور کرناٹک کے پٹھار ۔ ان سب علاقوں میں سے کچھ جگہوں پر تو آبادی میں دس فی صدی سے بھی زیادہ کمی ہوگئی تھی ۔ آبادی میں کمی 11 - 1901 کے عرصہ میں واقع ہونے والی خشک سالی ، پلیگ اور ملیریا کی وجہ سے کم تھی ۔ کچھ علاقوں میں مہاجرت کی وجہ سے بھی کمی ہوئی تھی ۔ اس لیے کہ 11 - 1901 کے دوران گنگا کے میدان سے تقریباً 12 لاکھ 50 ہزار افراد نقل مکانی کرکے ملک کے دوسرے حصوں میں جابسے تھے ۔

21 - 1901 کے دوران جن علاقوں کی آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ان میں پورے ملک کی تقریباً 11 فی صدی آبادی رہتی تھی ۔ مشرق میں صوبہ آسام کے گولپاڑا ، لکھیم پور ، نوگونگ اور سب ساگر اضلاع ، ناگالینڈ کا کوہیما ضلع ، تری پورا اور منی پور کے تمام اضلاع ایک خطّے کی شکل میں واقع ہیں اور یہاں 21 - 1901 میں اضافے کی فی صدی شرح 30 سے زیادہ تھی ۔ اسی طرح کے دوسرے خطّے مدھیہ پردیش ، اڑیسہ ، راجستھان ، گجرات ، مہاراشٹر ، آندھرا پردیش ، تامل ناڈ اور کیرالا صوبوں کے کچھ اضلاع تھے ۔ ایک اور خطّہ ہندوستان کے وسط مشرق میں مدھیہ پردیش کے بستر ، بلاسپور اور رائے گڑھ اضلاع ، اڑیسہ کے سندر گڑھ ، کیونجھر اور بالنگیر اضلاع ، آندھرا پردیش کے عادل آباد ، کریم نگر اور میڈک اضلاع پر مشتمل تھا ۔ جنوب مغرب میں تامل ناڈ کا کنیاکماری ضلع اور کیرالا کے کوٹایام ، الپے ، کوئلون اور تری وندرم اضلاع بھی اسی طرح کا ایک خطّہ بناتے تھے ۔

مذکورہ بالا خطوں میں مثبت اضافے کی مختلف وجوہ بتائی جاتی ہیں ۔ مثال کے طور پر وسط مغرب کا گیارہ ضلعوں پر مشتمل خطہ جو کہ راجستھان کے بھیل واڑہ ضلع سے شروع ہو کر مہاراشٹر کے دھولے ضلع تک پھیلا ہوا ہے ، کپاس کی کھیتی اور کپڑے کی صنعت کے لحاظ سے ایک اہم خطہ ہوگیا ۔ اس صنعت کی وجہ سے ہزاروں مزدور پیشہ یہاں آن بسے ۔ اسی طرح جزیرہ نمائے دکن کے جنوب مشرقی حصہ میں وہ خطہ جو پال گھاٹ درّے سے کنیاکماری تک پھیلا ہوا ہے ، ایسے مہاجرین سے آباد ہوا جن میں مزدوروں کی اکثریت تھی ، اس لیے کہ وہاں

چائے، قہوہ، ربر اور مسالوں کے پلانٹیشن قائم کیے جا چکے تھے ۔[11] زیادہ اضافے والے خطوں میں ناگالینڈ، مدھیہ پردیش کا ضلع بستر اور اڑیسہ کا ضلع سندر گڑھ جیسے علاقے بھی شامل تھے جہاں افزائش نسل کی بنا پر قبائلی لوگوں کی آبادی بڑھ رہی تھی۔

1921 سے 1951 تک ہندوستان کی آبادی میں کافی تیز رفتاری سے اضافہ ہوا لیکن ضلعی سطح پر کافی اختلافات رہے۔ اس دوران اضافے کی سالانہ شرح 1.46 فی صدی تھی جب کہ سابقہ بیس سالوں میں یہ شرح صرف 0.27 فی صدی تھی ۔ اس تیز رفتار اضافے کی وجوہ موت کی شرح میں کمی اور پیدائش کی شرح میں اضافہ تھیں ۔

51 - 1921 کے دوران آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ (75 فی صدی سے زائد) 27 ضلعوں میں ہوا ۔ یہ اضلاع ملک کے مشرق اور مغرب کے دور افتادہ علاقوں میں ہیں۔ مشرق میں برہم پتر کی وادی کے ساتھ تری پورا اور آسام کا مزد ہلز ضلع ایک ایسا ہی خطہ تھا۔ برہم پتر کی وادی میں زائد اضافے کی وجہ کثیر تعداد میں ان مزدوروں کی آمد تھی جو چائے کی کھیتی، تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور کوئلہ نکالنے کی صنعتوں میں مصروف تھے ۔ آسام کے مزد ہلز ضلع اور تری پورا میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) سے مہاجرین کی آمد نے وہاں کی آبادی میں اور بھی تیز اضافہ کیا ۔ مغرب میں بمبئی شہر اور اس سے ملحقہ گوداوری اور بھیما کی زیری وادی میں واقع اضلاع کی آبادی میں بھی کافی اضافہ ہوا ۔ اس خطے میں مہاجر مزدوروں کی توجہ کا مرکز کپاس کی صنعت تھی ۔ مذکورہ دو خطوں کے علاوہ ملک کے اور بھی کئی محدود علاقوں میں بھی کثیر اضافہ ہوا ۔ یہ محدود خطے عموماً یا تو صنعت و تجارت کے مراکز تھے، مثال کے طور پر کلکتہ اور بنگلور یا نیل گری ضلع کی طرح پلانٹیشن زراعت کا مرکز تھے ۔ دہلی، حیدرآباد اندور اور جودھ پور جیسے علاقوں میں بھی زیادہ اضافے کی وجہ روزگار کی تلاش میں لوگوں کی آمد تھی ۔[12]

51 - 1921 کی تیس سالہ مدت میں سب سے کم اضافہ (30 فی صدی یا اس سے کم) تقریباً 92 ضلعوں میں ہوا ۔ یہ اضلاع گنگا کے نچلے میدان، شمال کے پہاڑی علاقوں، مدراس (موجودہ تامل ناڈ)، اڑیسہ اور گجرات کے ساحلی میدانوں میں واقع ہیں ۔ پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام علاقے زیادہ تر کثیر آبادی کے خطے ہیں ۔

61 - 1951 کے دوران ہندوستان کی آبادی میں 21.6 فی صدی اضافہ ہوا ۔ دمن اور

ڈیو علاقوں کو چھوڑ کر پورے ملک کی آبادی میں مثبت اضافہ ہوا۔ سب سے زیادہ اضافہ مشرق اور مغرب کے دور افتادہ علاقوں میں تھا۔ ان علاقوں میں تری پورا، منی پور، آسام (شلانگ پلیٹو، سب ساگر اور کچھار اضلاع کو چھوڑ کر) اور مغربی بنگال کے سرحدی اضلاع شامل ہیں۔ آسام کی وادی اور مغربی بنگال کا دارجیلنگ ضلع اپنی چائے کی کھیتی کے لیے گذشتہ کئی سالوں سے مزدور طبقے کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کے گنجان آباد علاقے کے کافی لوگ برہم پتر کی وادی میں جاکر بستے رہے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے آنے والے پناہ گزینوں نے زیادہ تر برہم پتر کی وادی کو ہی آباد کیا تھا۔ مختصر یہ کہ 33 فی صدی سے زائد اضافے والے اس علاقے میں مہاجرین کی آمد ایک اہم عنصر تھا۔

شمال مغرب میں پنجاب اور جمنا پار خطے میں یکساں اضافہ ہوا۔ یہاں تیز رفتار اضافے کی وجہ ان پناہ گزینوں کی آمد تھی جو آزادی کے بعد مغربی پاکستان سے آکر اس علاقے میں بس گئے تھے۔ مذکورہ دو خطوں کے علاوہ تقریباً بارہ اور اضلاع ایسے ہیں جہاں آبادی میں اضافہ بہت زیادہ ہوا۔ یہ اضلاع ملک کے مختلف حصوں میں واقع ہیں۔ ان میں سے کچھ، مثلاً کرناٹک کا شموگا ضلع، اڑیسہ کا سندرگڑھ ضلع اور دہلی، کان کنی اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے اہم ہیں۔

سب سے کم اضافہ (9 فی صدی اور اس سے بھی کم) بارہ ضلعوں میں ہوا۔ ان ضلعوں میں سے چار تامل ناڈ میں، تین جموں اور کشمیر میں، ایک مہاراشٹر میں اور ایک پنجاب میں اور ایک مغربی بنگال میں ہے مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں گوا، دمن اور ڈیو اور پانڈی چیری بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

دس سال بعد 71 - 1961 میں ہندوستان کی آبادی میں اوسط اضافہ 24.8 فی صدی تھا۔ ہندوستان میں مجموعی طور پر گذشتہ دس سالہ مدت میں اضافے کی شرح بڑھی لیکن علاقائی اختلافات میں بھی اضافہ ہوا۔ موجودہ دہائی میں بھی زائد اضافے اور کم اضافے کے خطے گذشتہ دہائی کی طرح ملک کے مخصوص حصوں میں واقع تھے [13]

مغربی بنگال، آسام، ناگالینڈ، منی پور، تری پورا اور میگھالیہ کے زیادہ تر اضلاع تیز اضافے کے لحاظ سے قابل لحاظ ہیں۔ 71 - 1961 کے دوران آسام کے مزد ہنر ضلع کے علاوہ باقی تمام ضلعوں میں رفتار تیز تھی۔ جنوبی ہند میں کیرالا کے جنوبی اضلاع 1961 سے تیز

اضافے کے حامل تھے اور 1961 کے بعد یہ تیز رفتاری شمالی ضلعوں میں بھی آگئی۔ 71-1961 کے دوران کم اضافہ (20 فی صدی سے بھی کم) شمال کے پہاڑی علاقوں، وسطی گنگا کے میدانی علاقوں، راجستھان کے ریگستانی علاقوں، مغربی بنگال اور اڑیسہ کے میدانی خطوں، آندھرا پردیش مہاراشٹر اور تامل ناڈ کے ساحلی ضلعوں میں ہوا تھا۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ راجستھان اور شمال کے پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر بقیہ وہ تمام علاقے جن میں اضافہ کم ہوا تھا گنجان آبادی کے خطے ہیں۔ اصل میں ہندوستان کی آبادی میں علاقائی اضافے کا بہت کچھ انحصار اندرونی مہاجرت پر ہے۔ گنجان آبادی کے دیہی خطوں میں مہاجرین کی آمد نسبتاً کم ہوتی ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی جولائی 1979 میں 66 کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یہاں کی آبادی سے متعلق قومی پالیسی کا مقصد پیدائش کی شرح میں کمی کرنا تھا۔ 71 - 1961 کے دوران اضافے کی شرح 2.24 فی صدی فی سال تھی۔ رجسٹرار جنرل آف انڈیا کے دفتر کے مطابق 1975 میں اضافے کی شرح کم ہو کر 2.04 فی صدی ہو گئی تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دفتر مردم شماری کے مطابق 79 - 1975 کے دوران مذکورہ سالانہ شرح صرف 2 فی صدی تھی۔ اگر پیدائش کی شرح میں اسی طور پر کمی ہوتی رہی تو بھی ایک اندازے کے مطابق اکیسویں صدی کے وسط تک آبادی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

حوالے

(1) پران ناتھ، "قدیم ہندوستان کے اقتصادی حالات کا مطالعہ"، پروسیڈنگس آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، 1929، پانچواں باب۔

(2) کولن کلارک، "پاپولیشن گروتھ اینڈ لینڈ یوز"، لندن، 1967، ص ص 64 اور 75۔

(3) سابقہ حوالہ نمبر 1، ص 3۔

(4) ڈبلو، ایچ، مورلینڈ، "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر"، لندن، 1920، ص ص 22 - 9۔

(5) سابقہ حوالہ نمبر 4، ص ص 11 اور 12۔

(6) جی، ٹی، ترے وارتھا، "دی لیس ڈیولپڈ ریلم"، 1972، نیویارک، ص 350۔

(7) جے، ڈی، ڈیورنڈ، "عالمی آبادی کا جدید پھیلاؤ"، پروسیڈنگس آف دی امریکن فلاسفیکل

باب 7

عمر اور جنس اور ازدواجی درجہ

انسانی آبادی کے مطالعہ میں عمر اور جنس اور ازدواجی درجات اہم عناصر ہیں۔ ان عناصر کا مطالعہ اس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ آبادی کی اقتصادی اور سماجی خصوصیات کا انحصار بہت حد تک انہی پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آبادی میں اضافے کی شرح بھی عمر اور جنس اور ازدواجی درجات سے متعین ہوتی ہے۔

آبادی کی عمری ساخت : ہندوستان میں کم عمر افراد کی بہتات ہے۔ 14 سال کی عمر تک کے افراد کل آبادی کا تقریباً 42 فی صدی ہیں۔ اگرچہ یہ فی صدی بہت سے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں کم ہے تاہم یورپ کے کئی ترقی یافتہ ملکوں کی دگنی ہے۔ عام طور پر 15 سے 50 سال تک کے افراد اقتصادی اعتبار سے بارآور کاموں میں لگے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں اس زمرے میں تقریباً 46 فی صدی افراد آتے ہیں۔ یعنی 46 فی صدی آبادی پر 54 فی صدی آبادی کی کفالت کا بوجھ ہے۔ اس لحاظ سے بار کفالت کا تناسب ایک فی کس سے زیادہ ہے جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ تناسب 0.75 ہے[1]۔

ہندوستان کی آبادی میں عمر رسیدہ افراد نسبتاً کم ہیں۔ صرف 3 فی صدی کے لگ بھگ افراد ایسے ہیں جن کی عمر 65 سال سے زیادہ ہے، جب کہ فرانس، سویڈن اور برطانیہ میں یہ فی صدی تقریباً چار گنی ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہاں پر 8 افراد میں سے صرف ایک ملازمت یا کاروبار سے سبک دوش ہونے کی عمر کو پہنچ چکا ہوتا ہے[2] لیکن پھر بھی ان ملکوں میں بار کفالت بہت کم ہے کیونکہ وہاں کم عمر افراد کی تعداد ترقی پذیر ملکوں کی طرح بہت زیادہ نہیں ہے۔

کم عمر افراد کی کثرت موجود وسائل پر ایک بار ہوتی ہے۔ بعد میں جب یہ افراد کام کرنے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ان کے لیے روزگار فراہم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت بھی عمدہ طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا مزدور طبقہ

زیادہ تر یا تو غیر ہنرمند ہوتا ہے یا کم ہنرمند۔ اس طرح کم عمر افراد کی زیادتی سے وسائل کی کمی، اعلیٰ تعلیم و تربیت کی کمی اور بے روزگاری جیسی پریشانیاں سامنے آتی ہیں، جن سے سماجی، معاشی اور سیاسی پہلو بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی کی موجودہ ساخت میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں بہت نمایاں نہیں ہیں۔ 1921 اور اس سے پہلے 15 سال سے کم عمر افراد کا تناسب 40 فی صدی سے قدرے کم تھا۔ 1931 کے اعداد و شمار کے مطابق یہ ٹھیک 40 فی صدی تھا۔ اس کے بعد 1941 اور 1951 میں اس فی صدی میں گھٹا کمی ہوئی لیکن 1961 اور 1971 کے اعداد و شمار کے لحاظ سے یہ تناسب 41 اور 42 کے درمیان ہو گیا۔ 15 سال سے کم عمر کی عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں عموماً کم رہا ہے۔ اس کے برخلاف جوان عورتوں (15 سے 35 سال تک) کا تناسب مردوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ رہا ہے۔ 1881 میں جوان عورتیں کل عورتوں کا 34.9 فی صدی تھیں جب کہ مردوں میں یہ تناسب 33.9 تھا۔ پچاس سال بعد 1931 میں دونوں فی صدی اعداد میں تھوڑا سا اضافہ ہوا لیکن عورتوں کا تناسب زیادہ (35.4) اور مردوں کا کم (34.3) تھا۔ چالیس سال بعد 1971 میں جوان عورتوں کا تناسب کم ہو کر 31.4 فی صدی رہ گیا ہے اور جوان مردوں کا 30.1 فی صدی۔

ہندوستان میں عمر رسیدہ لوگوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے عمر رسیدہ عورتیں کم ہیں لیکن ان کا کل عورتوں میں تناسب مردوں کے کل مردوں میں تناسب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ 1971 میں 60 سال سے زائد عمر کے مردوں کا کل مردوں میں تناسب 5.9 فی صدی تھا جب کہ اس عمر کی عورتوں کا کل عورتوں میں تناسب 6.0 تھا۔

عمر کے لحاظ سے آبادی کی ساخت کو متاثر کرنے والے محرکات میں پیدائش، موت اور مہاجرت اہم ترین ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ عمر کے لحاظ سے آبادی کی ساخت پر مہاجرت کا کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح گذشتہ سالوں میں پیدائش کی شرح میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ 1921 سے پہلے اموات کی شرح زیادہ تھی جس سے آبادی کی عمری ساخت پر کافی اثر پڑتا تھا۔ 1901 کی مردم شماری کی رپورٹ میں قحط کے واقعات کا ذکر ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ قحط سے مرنے والوں میں زیادہ تر بوڑھے اور بچے تھے۔ لہٰذا قحط کے بعد آبادی میں جوان طبقے کا تناسب بڑھ گیا تھا۔ 1891 میں پانچ سال سے کم عمر

کے لڑکے 14.1 فی صدی اور لڑکیاں 15.3 فی صدی تھیں۔ قحط کی وجہ سے یہ تناسب 1901 میں بالترتیب 12.5 اور 13.3 فی صدی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد 1911 میں تھوڑا سا اضافہ ہوا اور تناسب بالترتیب 13.3 اور 14.3 ہو گئے۔ 1901 سے 1911 تک ملک قحط سالی سے محفوظ رہا لیکن کچھ علاقوں میں پلیگ اور ملیریا جیسی بیماریوں کا دور دورہ رہا۔ پلیگ سے واقع ہونے والی اموات زیادہ تر 10 سے 50 سال عمر کے افراد کے گروہ میں واقع ہوئی تھیں۔

1921 کے بعد بھی ہندوستان قحط اور وبائی بیماریوں سے محفوظ رہا لیکن سابقہ واقعات نے آبادی کی عمری ساخت کو کافی متاثر کر دیا تھا۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کا تناسب 1931 میں 1921 کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ جس کا سبب اس دہائی کی نسبتاً خوشحالی تھی۔ کم عمر افراد کے تناسب میں نسبتی اضافہ ان جوان لوگوں کے اموات کی وجہ سے بھی تھا جو انفلوئنزا کی نذر ہو گئے تھے [3]

پچھلے بیس تیس سال سے عام موت کی شرح اور بچوں کی موت کی شرح میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے اس کے مقابلے میں پیدائش کی شرح میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ نتیجے کے طور پر کم عمر اور جوان طبقے میں افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس صورتِ حال کی بنا پر ہندوستان بہت سے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل سے دوچار ہے۔

آبادی کی جنسی ساخت : ہندوستان میں مردوں کی تعداد عورتوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ پوری آبادی میں مردوں کا تناسب 51.73 فی صدی ہے اور بقیہ عورتیں ہیں۔ اس طرح یہاں کا جنسی تناسب 930 عورتیں فی ہزار مرد ہے۔ عورتوں کے تناسب میں کمی 1901 کی مردم شماری کے اعداد سے ظاہر ہوئی تھی اور جب ہی سے یہ کمی برقرار ہے۔ اس صدی کے شروع میں ہندوستان کی آبادی میں عورتوں کا تناسب 972 فی ہزار تھا، لیکن 70 سال بعد 1971 میں یہ صرف 930 رہ گیا تھا۔

ہندوستان میں غیر متوازن جنسی تناسب کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس ملک میں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد نر بچوں کی ہوتی ہے لیکن موت کا شکار بھی نر بچے ہی ہوتے ہیں [4] 15 سے 44 سال عمر کی عورتیں تناسب میں زیادہ ہیں۔ اس عمر کی عورتیں افزائشِ نسل کے اعتبار سے بالغ ہوتی ہیں یعنی زچگی کے واقعات اسی عمر میں ہوتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ دس فی صدی ہندوستانی زچائیں زچگی کے دوران میں موت کا شکار ہو جاتی ہیں [5]

گوشوارہ نمبر 13

ہندوستان کی آبادی کی عمری اور جنسی ساخت 1971

(فی صدی)

عمر	افراد	مرد	عورتیں
0 سے 9 تک	29.46	29.23	29.79
10 سے 14 تک	12.42	12.7[illegible]	12.11
15 سے 19 تک	8.73	8.96	8.49
2[illegible] سے 24 تک	7.90	7.62	8.24
25 سے 29 تک	7.44	7.09	7.82
30 سے 34 تک	6.61	6.42	6.83
35 سے 39 تک	6.01	6.07	5.96
40 سے 44 تک	5.19	5.32	5.05
45 سے 49 تک	4.17	4.37	3.95
50 سے 54 تک	3.77	3.91	3.57
55 سے 59 تک	2.30	2.37	2.21
60 سے 64 تک	2.61	2.62	2.61
65 سے 69 تک	1.24	1.24	1.25
70 اور زائد	2.15	2.06	2.14
کل	100.00	100.00	100.00

حوالہ — اعداد فی صدی کے لیے اعداد و شمار "انڈیا 1975"، حکومت ہند، نئی دہلی، ص ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں۔

گوشوارہ نمبر 14

ہندوستان میں مختلف عمروں کے افراد کا تناسب 1881 سے 1971 تک

(فی صدی)

سال	0 سے 14		15 سے 34		35 سے 59		60 اور زائد	
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
1971	42.0	41.9	30.1	31.4	22.0	20.7	5.9	6.0
1961	40.9	41.2	31.5	32.6	22.1	20.4	5.5	5.8
1951	37.1	37.9	34.3	34.4	23.1	21.9	5.5	5.8
1941	38.1	38.4	34.1	34.6	23.0	22.1	4.9	4.9
1931	40.0	40.0	34.3	35.4	21.8	20.4	3.9	4.2
1921	39.4	39.0	32.9	34.2	22.7	21.4	5.0	5.5
1911	38.8	38.1	33.9	35.1	22.5	21.3	4.8	5.5
1901	39.2	38.0	33.7	34.7	22.5	21.8	4.6	5.5
1891	39.8	38.7	33.5	34.6	22.1	21.0	4.6	5.7
1881	39.7	38.1	33.9	34.9	21.7	21.1	4.7	5.9

نوٹ ــ 1931 اور پہلے کے اعداد فی صدی میں ان علاقوں کے اعداد و شمار بھی شامل ہیں جو تقسیم کے بعد اب ہندوستان میں نہیں ہیں۔

حوالہ ــ ڈی، ٹی، نٹ راجن، "ایج اینڈ میریٹل اسٹیٹس"، سینسس آف انڈیا 1971 نئی دہلی، 1972، ص 2 ۔

1971 کے اعدادِ فی صدی" انڈیا 1975" حکومت ہند، نئی دہلی، ص 14 کے اعداد و شمار پر مبنی ہیں۔

عورتوں کی تعداد میں کمی کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی بیماریاں عورتوں کے لیے مخصوص ہیں، جن کی وجہ سے بھی جنسی تناسب پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ صدی کے شروع میں قحط سالی اور وبائی بیماریوں سے عورتوں کی اموات مردوں کی اموات کے مقابلے میں زیادہ ہوئی تھیں 6

علاقائی اعتبار سے جنسی تناسب میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان کے سات صوبے ایسے ہیں جن میں شروع صدی سے ہی عورتوں کا جنسی تناسب کم رہا ہے۔ یہ تمام صوبے شمالی ہندوستان میں ہیں۔ جموں کشمیر، ہریانہ، پنجاب، اتر پردیش، آسام، مغربی بنگال اور راجستھان سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں، دہلی اور چنڈی گڑھ میں، بھی یہی خصوصیت رہی ہے۔ انڈمان اور نکوبار جزیروں میں جنسی تناسب موجودہ صدی کے شروع میں انتہائی کم (318 عورتیں فی ہزار مرد) تھا لیکن بعد میں اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ پھر بھی 1971 میں یہاں کا جنسی تناسب کافی غیر متناسب تھا۔

آسام کے میدانی علاقوں میں عورتوں کا نسبتاً کم تناسب نقل وطن کر کے آنے والے مردوں کی وجہ سے ہے۔ اس علاقے میں قابل کاشت زمین کے اضافے اور چائے کی پلانٹیشنوں کے فروغ کی وجہ سے مزدوروں کی مانگ میں اضافہ ہوتا رہا اور باہر سے آنے والے مزدوروں میں عورتوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ شمال مغربی علاقے میں عورتوں کی کمی تین عناصر کے باعث ہوئی ہے 7 (1) کثیر تعداد میں نر بچوں کی پیدائش۔ (2) ان علاقوں میں رائج پدرانہ نظام میں عورتوں کا کمتر مقام۔ اور (3) مخصوص وبائی بیماریاں جن کا شکار عورتیں زیادہ رہی ہیں۔

ہندوستان میں آٹھ صوبے ایسے ہیں جن میں عورتوں کا جنسی تناسب اوسط سے زیادہ ہے۔ ان میں بہار اور منی پور کو چھوڑ کر باقی چھ صوبے (مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، کرناٹک، اڑیسہ، تامل ناڈ اور کیرالا) جنوبی ہند میں واقع ہیں اور علاقائی اعتبار سے متصل ہیں۔ یہ آٹھ صوبے موجودہ صدی کے شروع سے ہی ملک کے اوسط تناسب سے آگے رہے ہیں۔ دادرا اور ناگر حویلی میں پچھلے بیس سال سے جنسی تناسب اوسط سے زیادہ ہے۔ شروع میں یہاں عورتوں کی تعداد اوسط سے کم تھی۔ گوا، دمن اور ڈیو، لکش دیپ، مزورم اور پانڈی چری ایسے علاقے ہیں جن میں عورتیں مردوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہیں۔ 1971 کے اعداد و شمار سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس توازن میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے لیکن اب بھی یہاں عورتوں کی تعداد ملک کے اوسط سے کہیں زیادہ ہے۔ جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عورتوں کا جنسی تناسب 1000 سے زیادہ ہے۔ اصل میں ان علاقوں سے ترک وطن کر کے جانے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ رہی ہے اور پسماندگان میں عورتوں کی زیادتی کی وجہ سے جنسی تناسب زیادہ رہا ہے 9

ہندوستان کے عام عمرانیاتی طرز کے مطابق عورتوں کے تناسب میں بتدریج کمی ہو رہی ہے۔ خاص طور پر 1961 اور 1971 کے درمیان زیادہ تر علاقوں میں یہی صورت حال رہی ہے۔ صرف چھ صوبوں اور مرکز کے زیر انتظامی چار علاقوں میں جنسی تناسب میں اضافہ ہوا ہے۔ بقیہ علاقوں میں قابل لحاظ کمی واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ مہاراشٹر، منی پور، اڑیسہ اور تامل ناڈ صوبوں میں عورتوں کے تناسب میں شروع صدی سے ہی بتدریج کمی ہو رہی ہے تاہم ان صوبوں کا جنسی تناسب اب بھی ملک کے اوسط سے زیادہ ہے۔ انڈمان اور نکوبار جزیروں اور دادرا اور ناگر حویلی میں عورتوں کا تناسب غیر معمولی طور پر بڑھ رہا ہے۔ دادرا اور ناگر حویلی میں یہ تناسب مردوں کے تناسب سے تجاوز کر گیا ہے لیکن انڈمان اور نکوبار جزیروں میں عورتوں کی تعداد اب بھی اوسط سے کہیں کم ہے۔ اور دوسرے علاقوں میں جنسی تناسب میں اضافہ انتہائی خفیف ہے۔

ہندوستان میں شادیاں — ہندوستان میں ازدواجی طرز کی تین خصوصیات ہیں: (1) شادی کا ہمہ گیر ہونا۔ (2) کم عمر میں شادی کا رواج، خصوصاً عورتوں میں۔ اور (3) بیواؤں کی کثیر تعداد۔ پچھلے سو سال کے اعداد و شمار اس بات کے شاہد ہیں کہ عام طور پر ہر ہندوستانی عمر کی کسی نہ کسی منزل میں شادی ضرور کرتا ہے۔ یہ ازدواجی صورت حال اس بات سے اور واضح ہو جاتی ہے کہ 1971 میں پچاس سال سے زیادہ عمر کے افراد میں صرف 3 فی صدی مرد ایسے تھے جنھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اس ضمن میں عورتوں کا تناسب بہت ہی کم (0.9 فی صدی) تھا۔ 1891 کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے اس وقت بھی غیر شادی شدہ افراد کی تعداد اتنی ہی کم تھی اگرچہ غیر شادی شدہ عورتوں (50 سال سے زیادہ عمر) کا تناسب ایک فی صدی سے کچھ ہی کم، یعنی موجودہ کا دگنا، تھا۔ 1941 اور اس سے پہلے 14 سال کی عمر تک کی لڑکیوں کا تناسب غیر شادی شدہ عورتوں کے تناسب سے زیادہ تھا (گوشوارہ نمبر 16)۔ اس سے واضح ہے کہ 14 سال سے کم عمر کے زمرے میں بھی شادی شدہ عورتیں شامل تھیں۔ لیکن یہ طرز

گوشوارہ نمبر 15

ہندوستان میں جنسی تناسب

1901 سے 1971 تک

ملک اور صوبے	عورتیں فی 1000 مرد							
	1901	1911	1921	1931	1941	1951	1961	1971
ہندوستان	972	964	955	950	945	946	941	930
آندھرا پردیش	985	992	993	987	980	986	981	977
آسام	919	915	896	874	875	868	869	896
بہار	1054	1044	1016	994	996	990	994	954
گجرات	954	946	944	945	941	952	940	934
ہریانہ	867	835	844	844	869	871	868	867
ہماچل پردیش	884	889	890	897	890	912	938	958
جموں و کشمیر	882	876	870	865	869	873	878	878
کرناٹک	983	981	969	965	960	966	959	957
کیرالا	1004	1008	1011	1022	1027	1028	1022	1016
مدھیہ پردیش	990	986	974	973	970	967	953	941
مہاراشٹر	978	966	950	947	949	941	936	930
منی پور	1037	1029	1041	1065	1055	1036	1015	980
میگھالیہ	1036	1013	1000	971	966	949	937	942
ناگالینڈ	973	993	992	997	1021	999	933	871
اڑیسہ	1037	1056	1086	1067	1053	1022	1001	988
پنجاب	832	780	799	815	836	844	854	865

(بقیہ گوشوارہ نمبر 15)

ملک اور صوبے	1901	1911	1921	1931	1941	1951	1961	1971
راجستھان	905	908	896	907	906	921	908	911
تامل ناڈ	1044	1042	1029	1027	1012	1007	992	978
تری پورا	874	C85	885	885	886	904	932	943
اتر پردیش	937	915	909	904	907	910	909	879
مغربی بنگال	945	925	905	890	852	865	878	891

ع[1] پانڈی چری مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقے کو چھوڑ کر۔

ع[2] 1951 کے جنسی تناسب کے لیے 61-1941 کے اعداد وشمار کا اوسط لیا گیا ہے۔

حوالہ ــــ "انڈیا 1976" ، حکومت ہند ، نئی دہلی ، ص 92 ۔

گوشوارہ نمبر 16

ہندوستان کے ازدواجی درجات

1881 سے 1971 تک

سال	مرد (فی صدی)				عورتیں (فی صدی)			
	پندرہ سال سے کم عمر افراد	غیر شادی شدہ	شادی شدہ	طلاق شدہ یا بیوی سے محروم	پندرہ سال سے کم عمر افراد	غیر شادی شدہ	شادی شدہ	طلاق شدہ یا بیوہ
1971	42.0	55.3	41.6	3.1	41.9	45.2	45.7	9.1
1961	40.9	52.9	43.0	4.1	41.2	42.3	46.3	11.3
1951	37.1	49.1	45.8	5.1	37.9	38.8	48.4	12.8
1941	38.1	49.0	45.3	5.7	38.4	36.9	48.0	15.1
1931	40.0	47.9	46.7	5.4	40.0	34.6	49.9	15.5
1921	39.4	49.8	43.8	6.4	39.0	35.8	46.7	17.5
1911	38.8	49.0	45.6	5.4	38.1	34.4	48.3	17.3
1901	39.2	49.2	45.4	5.4	38.0	34.4	47.6	18.0
1891	39.8	48.7	46.5	4.8	38.7	33.9	48.5	17.6
1881	39.7	48.4	46.7	4.9	38.1	32.3	49.0	18.7

نوٹ — 1881 سے 1941 تک ہندوستان کی تقسیم سے پہلے۔

حوالے — ڈی، ٹی، نٹ راجن، "ایج اینڈ میریٹل اسٹیٹس"، سینسس آف انڈیا 1971،
نئی دہلی، 1972، ص 88۔
"انڈیا 1975"، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 10۔

اب رفتہ رفتہ بدل رہا ہے۔

کم عمر کی شادیاں ہندوستان میں عام رہی ہیں۔ بچپن میں شادی کر دینے کا رواج اب بہت کم ہوگیا ہے لیکن بہت سی شادیاں اب بھی مقررہ عمر سے پہلے کی جاتی ہیں۔ 1929 میں شادی کی کم سے کم عمر عورتوں کے لیے 15 سال اور مردوں کے لیے 18 سال مقرر کردی گئی تھی۔ 1971 کے اعداد و شمار کے مطابق شادی شدہ مردوں کی تعداد 12 کروڑ 5 لاکھ تھی اور زیادہ تر شادیاں 10 سے 14 سال کی عمر میں ہوئی تھیں۔ پھر بھی شادی عمر پر قید لگانے سے کچھ نہ کچھ مثبت اثر ہوا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مذہبوں کی عورتوں کا اوسط لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس صدی میں شادی کی عمر 13 سال سے بڑھ کر 16 سال ہوگئی ہے [9]

حکومت ہند نے اب شادی کے لیے کم سے کم عمر مردوں کے لیے 18 سال سے بڑھا کر 21 سال اور عورتوں کے لیے 15 سال سے بڑھا کر 18 سال کر دی ہے۔ اس قانون کا بھی شادی کی اوسط عمر پر مثبت اثر ہوگا۔

گوشوارہ نمبر 17 سے ظاہر ہے کہ 1891 سے 1921 تک شادی کی اوسط عمر میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اضافہ مردوں اور عورتوں دونوں کی شادی کی عمروں میں دکھائی دیتا ہے۔ گوشوارے میں شادی کی اوسط عمر کے واسطے شادی شدہ افراد کے اعداد و شمار ایک مخصوص انداز سے لیے گئے ہیں۔ عورتوں میں 35 سال تک اور مردوں میں 50 سال تک کے شادی شدہ افراد کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ عمر کی اس قید کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ عمر کے افراد کے بارے میں اعداد و شمار کسی اصول سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جو امکانات اس مقررہ عمر کے شادی شدہ افراد میں پائے جاتے ہیں وہ زیادہ عمر کے افراد کی شادی میں نہیں پائے جاتے۔ علاوہ ازیں 35 سال کی عمر تک صرف 1 یا 2 فی صدی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی شادی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کو خارج کرنے سے تعدادی اعتبار سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا [10]

31-1921 کی دہائی میں دونوں جنسوں کی شادی کی اوسط عمروں میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ سارداا ایکٹ تھا جس میں بچوں کی شادی پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ "سارداا ایکٹ" قانون ساز اسمبلی میں 1927 میں پیش کیا گیا تھا۔ پہلے پہل تجویز یہ تھی کہ اس کا اطلاق صرف ہندو طبقے پر ہی ہوگا لیکن بعد میں یہ ایکٹ تمام مذہبی طبقوں پر نافذ کر دیا گیا۔ یہ ایکٹ 28 ستمبر 1929 کو پاس ہوا تھا اور اس کا نفاذ یکم اپریل 1930 سے ہوا تھا۔ ایکٹ پاس

ہونے اور اس کے نفاذ ہونے کے درمیانی وقفے کو غنیمت جان کر بڑی تعداد میں عوام نے اپنے بچوں کی شادیاں کر ڈالیں [11] بہرحال قانون کے نفاذ کے بعد 41-1931 کے دوران شادی کی اوسط عمر میں اضافہ ہوا۔ عورتوں کے سلسلے میں یہ اضافہ مسلسل ہو رہا ہے، لیکن مردوں کی شادی کی اوسط عمر میں اس طرح کا تدریجی تسلسل نہیں ہے۔ پھر بھی 61-1951 کے دوران نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

شادی کے وقت اوسط عمر میں علاقائی اعتبار سے نمایاں فرق دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں میں عام طور پر جنوبی، شمال مغربی اور مشرقی ریاستوں میں نسبتاً زیادہ عمر میں شادیوں کا رواج ہے۔ ان ریاستوں میں کیرالا، تامل ناڈ، کرناٹک، آسام، پنجاب، مغربی بنگال اور مہاراشٹر شامل ہیں۔ آندھرا پردیش میں یہ اوسط سب سے کم (11.35 سال) ہے۔ مردوں کی شادی کی اوسط عمر میں بھی اسی طرح کا فرق نظر آتا ہے۔ مدھیہ پردیش کا وہ علاقہ جسے مدھیہ بھارت کہا جاتا تھا شادی کے وقت مردوں کی اوسط عمر کے لحاظ سے کمترین مقام پر ہے، اور کرناٹک اور کیرالا بالاترین مقام پر ہیں۔

مختلف مذہبی فرقوں میں بھی شادی کی اوسط عمروں میں نمایاں اختلافات دکھائی دیتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے عیسائی لوگوں کی شادی کی اوسط عمر سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد سکھوں اور مسلمانوں کا نمبر آتا ہے [12] اس مذہبی تفریق پر علاقائی تفریق غالب ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ بہت سے نومذہب افراد ہندو مذہب چھوڑ کر کوئی دوسرا نیا مذہب اپنا چکے ہیں تاہم انہوں نے ہندو سماج کے رسم ورواج ترک نہیں کیے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوستان کے عیسائیوں میں بھی بچپن میں شادی کرنے کا رواج پایا جاتا ہے [13]

1961 کے اعداد و شمار (گوشوارہ نمبر 18) سے واضح ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی شادی کی اوسط عمر زیادہ ہے لیکن کچھ صوبے ایسے ہیں جن میں عورتوں کی شادی کی اوسط عمر خاصی زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں کیرالا، کرناٹک، آسام، مغربی بنگال اور پنجاب قابل ذکر ہیں جہاں شہری عورتوں میں شادی کی اوسط عمر 19 سال یا اس سے زیادہ ہے۔ یہ اوسط عمر بہت سے صوبوں کے دیہی مردوں کی شادی کی اوسط عمر سے بھی زیادہ ہے۔ آسام، کیرالا، کرناٹک اور تامل ناڈ صوبوں میں شادی کی اوسط عمریں پورے ملک کے اوسط سے زیادہ ہیں۔ اس کے برخلاف بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش پورے ملک کے اوسط سے

گوشوارہ نمبر 17
ہندوستان میں شادی کی اوسط عمریں

مختلف دہائیاں	عورتوں کی شادی کی اوسط عمریں	مردوں کی شادی کی اوسط عمریں
1891 سے 1901 تک	12.77	21.01
1901 سے 1911 تک	13.04	20.44
1911 سے 1921 تک	13.52	20.74
1921 سے 1931 تک	12.50	18.45
1931 سے 1941 تک	14.93	20.34
1941 سے 1951 تک	15.38	19.93
1951 سے 1961 تک	15.43	21.76

نوٹ — شادی کی اوسط عمروں کے لیے 35 سال عمر تک کی شادی شدہ عورتوں اور 50 سال عمر تک کے شادی شدہ مردوں کے اعداد و شمار کو استعمال کیا گیا ہے۔

حوالہ — ایس، این، اگروالا "انڈیاز پاپولیشن پرابلمز"، 1974، نئی دہلی، ص 74۔ اگروالا نے یہ اعداد و شمار مختلف مردم شماریوں کی مختلف رپورٹوں سے مرتب کئے ہیں۔

گوشوارہ نمبر 18

رہائش کے اعتبار سے ہندوستان اور صوبوں میں مردوں اور عورتوں کی شادی کی اوسط عمریں 1961

ہندوستان اور صوبے	مرد		عورتیں	
	شہری	دیہی	شہری	دیہی
آندھرا پردیش	23.6	21.9	16.5	14.8
آسام	25.9	25.7	19.1	18.5
بہار	21.1	18.3	16.1	14.1
گجرات	22.9	20.8	18.4	16.7
جموں وکشمیر	24.2	22.0	17.8	15.7
کیرالا	27.8	26.1	20.8	19.8
مدھیہ پردیش	21.6	17.8	16.0	13.5
مہاراشٹر	24.4	21.3	18.2	14.8
میسور (کرناٹک)	25.3	24.0	20.4	15.06
اڑیسہ	23.4	21.7	16.9	16.3
پنجاب	23.3	21.2	19.0	17.1
راجستھان	20.2	18.9	15.5	14.0
تامل ناڈ	25.8	24.8	18.7	18.2
اتر پردیش	21.6	18.2	17.0	14.1
مغربی بنگال	25.9	23.2	19.1	14.9
ہندوستان	23.8	21.0	17.8	15.4

حوالہ ”سینسس آف انڈیا 1961ء جلد اول، حصہ دوم، سی (1)، ۴۴، 89-37 -

کم ہیں ۔

ہندوستان کی بیوائیں ـــ عورتوں میں افزائش نسل صلاحیت کو اگر عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عام طور پر پندرہ سال سے پینتالیس سال عمر کی عورتیں باصلاحیت تسلیم کی جاتی ہیں ۔ عمرانیات کے کچھ ماہرین پندرہ سے انچاس سال کی مدت کو زیادہ صحیح تسلیم کرتے ہیں[14] اس معینہ مدت میں ایک عورت جتنے دن اپنے شوہر کے ساتھ گزارتی ہے صرف اتنے ہی دن نسل کی افزائش کے اعتبار سے "بارآور" ہوتے ہیں ۔ ہندوستان کے آبادیاتی مطالعوں میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ ایک تو یہاں بیواؤں کی تعداد خاصی ہے اور دوسرے سماجی پابندیوں کی وجہ سے عموماً بیواؤں کی دوبارہ شادی نہیں ہوتی ۔ بیوگی کے باعث "بارآور مدت" یقیناً متاثر ہوتی ہے ۔ ادھر کچھ سالوں سے بیواؤں کی شادیاں ہونے لگی ہیں ، اور اخلاقی اعتبار سے یہ بات خوش آیند ہے کہ بیواؤں کو بیوی کی حیثیت سے دوبارہ قبول کیا جانے لگا ہے ۔ بہر حال عمرانیاتی نقطۂ نظر سے یہ بات آبادی میں اضافہ کے لیے اہم ہے اس لیے کہ بیواؤں کی دوبارہ شادی ہونے سے افزائش نسل کے اعتبار سے ان کی "بارآور" مدت میں اضافہ اور مزید بچوں کی پیدائش کا امکان ناگزیر ہے ۔

1971 میں کل عورتوں میں بیواؤں کا تناسب 8.7 فی صدی تھا ۔ دس سال پہلے یہ تناسب 10.8 اور چالیس سال پہلے 16.1 فی صدی تھا ۔ گویا کہ چالیس سال کی مدت میں بیواؤں کا تناسب تقریباً آدھا رہ گیا ہے ۔ اس تناسب میں بتدریج کمی کے معنی یہ ہیں کہ نسل کی افزائش کے امکان میں اضافہ ہورہا ہے ۔

ایس ، این ، اگروالا نے عورتوں کی "بارآور" مدت دریافت کرنے کے لیے پندرہ سے پینتالیس سال عمر کو مدنظر رکھا ہے اور ایک جامع مطالعے میں اس پہلو کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے[15] 1951 - 61 کی دس سالہ مدت میں ہندوستان میں بیواؤں کی بوقت بیوگی اوسط عمر 34 سال تھی ۔ 1911 - 21 اور 1931 - 41 کو چھوڑ کر اس صدی کے شروع سے ہی یہ عمر 30 سال سے زیادہ رہی ہے ۔ 1911 - 21 میں بوقت بیوگی اوسط عمر 29.8 سال تھی اور اس کمی کی توجیہ انفلوئنزا کی وبا اور پہلی جنگ عظیم کے اثرات سے کی جاسکتی ہے ۔ اس کے بعد 1931 - 41 میں بوقت بیوگی عورتوں کی اوسط عمر 28.8 تھی ۔ اصل میں یہ وہ وقت تھا جب سارداایکٹ کی پابندی عائد ہونے سے پہلے پہلے بہت سے لوگوں نے جلد ہی جلدی بچوں کی شادیاں کروا لی تھیں ۔ 1951 - 61 کے

دوران اوسط عمر میں اضافہ اس بات کی علامت تھی کہ مردوں موت کی شرح میں تخفیف ہوتی تھی۔ علاقائی اعتبار سے آسام اور مغربی بنگال میں اوسط عمر میں کمی اصل میں مردوں کی شرحِ اموات میں اضافے کی وجہ سے تھی۔

ہندوستان میں بچپن کی شادیوں کے اب بھی کچھ اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بہت سے علاقوں میں شادی کے فوراً بعد بیوی اور شوہر ایک ساتھ نہیں رہتے ہیں۔ یہ بات اس صورت میں اور بھی عام ہوتی ہے جب شادی کم عمر میں ہوجاتی ہے۔ شادی کے بعد "گونا" یا "وداع" کی رسم سے حقیقی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی مردم شماری سے حاصل اعداد و شمار گونا یا وداع کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم نہیں کرتے۔ بہرحال یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جو شادیاں پندرہ سال کی عمر سے پہلے کردی جاتی ہیں ان کا گونا پندرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے جب کہ پندرہ سال یا زیادہ عمر میں ہونے والی شادیوں کا گونا اسی وقت ہوجاتا ہے۔ وہ عورتیں جو وقت پیدائش سے پندرہ سال کے زمرے میں آتی ہیں اگر شادی کرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر سے پہلے ہی بیوہ بھی ہوجاتی ہیں یا طلاق پا جاتی ہیں تو ان کا ایک سال بھی ایسا نہیں گزرتا جسے "بار آور" کہا جاسکے۔ اس کے برخلاف کچھ تعداد ایسی عورتوں کی بھی ہے جو "بار آور" مدت کے تیسوں سال گزارتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ شادی شدہ 45 سال سے پہلے ہی بیوہ ہوجاتی ہیں یا طلاق پا جاتی ہیں۔ ان کی زندگی کا صرف ایک حصہ بار آور کہا جاسکتا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگروالا نے افزائش نسل کے لحاظ سے "بار آور" عمر کی تحقیق کی ہے۔

گوشوارہ نمبر 19

افزائشِ نسل کے اعتبار سے عورتوں کی زندگی میں "بار آور" مدت

سال	مدت کا آغاز عمر کے لحاظ سے	مدت کا اختتام عمر کے لحاظ سے	اوسط مدت سالوں میں
1901-11	16.1	37.1	21.0
1911-21	16.1	34.4	18.3
1921-31	16.0	39.9	23.9
1931-41	17.0	33.8	16.8
1941-51	17.0	39.9	22.9
1951-61	17.0	42.0	25.0

گوشوارے سے ظاہر ہے کہ شادی شدہ عورتیں اپنی تیس سالہ بارآور زندگی میں سے اوسطاً 10 سے 13 سال کی مدت بیوگی یا طلاق کی وجہ سے ضائع کر دیتی ہیں۔ نسل کی افزائش کے اعتبار سے عورتوں کی بارآور مدت 1901-11 کے دوران اوسطاً 21 سال تھی جو 1921-31 کے دوران 23.9 اور 1951-61 کے دوران 25.0 ہو گئی تھی۔ اس طرح پچاس سال کے وقفے میں اس مدت میں 4 سال کا اضافہ ہوا ہے۔

حوالے

(1) ایس، این، اگروالا، "انڈیاز پاپولیشن پرابلمز"، نئی دہلی، 1974، ص 44۔
(2) ڈی، جے، بوگ، پرنسپلز آف ڈیموگرافی" نیویارک، 1969 ص 161۔
(3) ڈی، نٹ راجن، "ایج اینڈ میریٹل اسٹیٹس"، سینسس آف انڈیا 1971 نئی دہلی، 1972، ص 3۔
(4) جی، ٹی تری وار تھا، "دی لیس ڈیولپڈ ریلم"، نیویارک، 1972، ص 386۔
(5) جی، ایس، گوسائی، "ریجنلزم آف سیکس کمپوزیشن آف انڈیاز پاپولیشن"، رورل سوشیولوجی، جلد 26، 1961، ص ص 122، 123۔
(6) سابقہ حوالہ 4، ص 387
(7) سابقہ حوالہ 5، ص ص 130، 131۔
(8) سابقہ حوالہ 4، ص 389۔
(9) ایس، چندر شیکھر، "انفینٹ مرٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا"، لندن، 1972، ص 252
(10) سابقہ حوالہ 1، ص 73۔
(11) "سینسس آف انڈیا، 1931"، جلد اول، حصہ اول، ص ص 234-229۔
(12) سابقہ حوالہ 10 ص 79۔
(13) "سینسس آف انڈیا، 1901"، جلد اول، حصہ اول، ص ص 545، 544۔
سینسس آف انڈیا، 1921 جلد اول، حصہ اول، ص 543۔
(14) جی، ڈبلو، برکلے، "ٹیکنیکس آف پاپولیشن انالسس"، نیویارک، 1958، ص ص 51 اور 171۔
(15) سابقہ حوالہ 1، ص ص 101-96

باب 8

ہندوستان کی آبادی کی ساخت

ہر علاقے کی آبادی کچھ مقررہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہے ۔ مطالعہ کی سہولت کے خاطر ان خصوصیات کو فطری ، معاشی اور سماجی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ آبادی کے ہر فرد کی خصوصیات ان ہی تینوں زمروں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ مجموعی آبادی میں تمام افراد کی خصوصیات مجموعی طور پر دیکھی جاسکتی ہیں ۔ آبادی کی اصل ساخت سمجھنے کے لیے ہر زمرے کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرنا بہتر ہوتا ہے ۔

اقتصادی اعتبار سے آبادی کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے ، ایک تو وہ جو کہ اقتصادی اعتبار سے فعال ہے یعنی وہ طبقہ جو روزگار میں ہے اور دوسرا وہ جو کہ غیر فعال ہے یا بے کار ہے روزگاری طبقے کو مزید حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے ، مثلاً زراعت پیشہ لوگ ، صنعت و حرفت میں مشغول لوگ ، مختلف خدمات انجام دینے والے لوگ ، وغیرہ ۔ اسی طرح سماجی خصوصیات کے تحت بھی آبادی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ۔ علاوہ ازیں رہائشی اعتبار سے آبادی کی دیہی و شہری تقسیم بھی آبادی کی ساخت کا ایک پہلو ہے ۔

ہندوستان میں آبادی کی معاشی تقسیم

ہندوستان کی 80 فی صدی آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے ۔ دیہی علاقوں میں عام طور پر زراعت اہم ترین پیشہ ہے ۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ہندوستان کے جملہ کارکنوں میں سے 70 فی صدی لوگ کسان اور زرعی مزدور ہیں ۔ اس لیے دوسرے معاشی میدانوں میں کارکنوں کا تناسب کم ہے ۔ دراصل دیہی و زرعی معیشت تقریباً تمام ہی ترقی پذیر ملکوں میں اہم ترین پیشہ ہے ۔ ترقی یافتہ ملکوں کے برخلاف ان ملکوں میں بہت کم لوگ صنعت و حرفت کے ذریعے روزی حاصل کرتے ہیں ۔

1971 میں ہندوستان میں جملہ کارکنوں کی تعداد تقریباً 18 کروڑ تھی یعنی کل آبادی کی 32.92 فی صدی۔ ان کارکنوں میں سے صرف دس فی صدی افراد منظم طور سے کام کرتے تھے اور بقیہ روایتی طور پر کسان اور زرعی مزدوروں کا تناسب 69.67 فی صدی تھا۔ کام کرنے والوں میں زیادہ تعداد (55.97 فی صدی) مردوں کی تھی، لیکن زرعی امور میں عورتیں بھی کافی ہاتھ بٹاتی تھیں۔ صنعت وحرفت میں صرف 9.46 فی صدی کارکن تھے جن میں سے 90 فی صدی مرد تھے۔ تیسرا اہم پیشہ ملازمت تھا اور خالص نوکری پیشہ افراد کا تناسب کل آبادی کا 8.74 فی صدی تھا۔

ریاستی سطح پر زراعت اور متعلقہ کاموں میں افراد کا تناسب 38 سے 79 فی صدی تک تھا۔ اضلاعی سطح پر اس تناسب میں فرق اور بھی زیادہ رہا ہوگا۔ ہندوستان کے پانچ بڑے صوبوں کے کارکنوں کی مجموعی تعداد میں سے 75 فی صدی سے زیادہ زرعی معیشت سے وابستہ تھے۔ ان صوبوں میں ایک تو شمال میں واقع جموں اور کشمیر ہے، اور باقی چار صوبے (راجستھان، اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور بہار) شمالی ہندوستان میں ایک خطے کی شکل میں ہیں۔ اس خطے میں وسطی اور اوپری گنگا کے میدانی علاقے اور کوہ ست پڑا کے شمال کا پہاڑی حصہ شامل ہیں۔ اگرچہ اس خطے میں طبعی اختلافات کافی ہیں تاہم زراعت ایک مشترکہ علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل میں ان پانچوں صوبوں میں شہری آبادی کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان علاقوں میں صنعت اور خدمات کے زمروں کے روزگاروں کی کمی ہے[1]

ہندوستان میں چار ریاستیں ایسی ہیں جن میں زرعی کارکنوں کا تناسب ملک کے اوسط تناسب (70 فی صدی) سے کم ہے۔ پنجاب اور تامل ناڈ ریاستوں میں تناسب ملک کے اوسط تناسب سے کوئی دس فی صدی نیچا ہے اور مغربی بنگال اور کیرالا میں یہ فرق اور بھی نمایاں ہے۔ ان دونوں ریاستوں میں صنعتی زمرہ ملک کے اوسط سے زیادہ وسیع ہے۔ کیرالا میں ماہی گیری ایک اہم پیشہ ہے لیکن اس کے علاوہ بعض تجارتی فصلیں، مثلاً چائے، قہوہ اور ناریل، بہت سے ایسے کاروبار کو جنم دیتی ہیں جو غیر زرعی زمرے میں شامل ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر جگہ جگہ مختلف قسم کے کارخانے ملتے ہیں جن میں تجارتی فصلوں سے حاصل اشیا کو صنعتی مرکب کی شکل دے کر فروخت کے قابل بنایا جاتا ہے۔ مغربی بنگال

میں کلکتہ کے قریب دریائے ہگلی کے کنارے بہت بڑا تجارتی وصنعتی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔
اس خطے کے دیہی علاقوں میں 25 سے 55 فی صدی لوگ غیر زرعی پیشوں میں معروف ہیں 2
ہندوستان کی 67 فی صدی آبادی اقتصادی اعتبار سے غیر فعال یا بے کار ہے۔ اگر
اس تناسب میں سے کم عمر افراد کو الگ کر دیا جائے تو 25 فی صدی آبادی ایسی ہے جس کو یقیناً
روزگار کی تلاش ہے۔ بے روزگاری کے مسئلے کا براہ راست حل منظم اقتصادی حلقے میں
تو امید افزا ہے لیکن غیر منظم حلقوں میں روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنا ایک مشکل امر ہے۔
کارکنوں کی خوشحالی کے لیے حکومت نے جتنے قانون بنائے ہیں وہ زیادہ تر منظم اقتصادی
حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف قسم کے سماجی ومعاشی تحفظ کے قوانین جن میں کارخانوں
کے انتظام، مزدوری، بیمہ، پراویڈنٹ فنڈ، پنشن وغیرہ سے متعلق قوانین شامل ہیں صرف
منظم حلقے تک ہی محدود ہیں۔ منظم حلقوں میں زیادہ تر کارکن فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔
1971 میں چالو فیکٹریوں میں کارکنوں کی تعداد یومیہ روزگار کے حساب سے 50 لاکھ 80 ہزار تھی۔
بے روزگاری سے متعلق اعداد و شمار روزگار دفتروں میں درج اطلاعات کے ذریعے ملتی
ہیں۔ چونکہ یہ روزگار دفتر شہری علاقوں میں واقع ہوتے ہیں اس لیے زیادہ شہری آبادی ہی کی
خدمت کرتے ہیں اور دیہی حالات کی عکاسی نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں کچھ نوکری پیشہ لوگ بہتر
موقعوں کی تلاش میں دوبارہ رجسٹریشن بھی کرا لیتے ہیں۔ اس طرح کی گڑبڑ کی وجہ سے بیروزگاری
کے صحیح اعداد و شمار مہیا نہیں ہو پاتے۔ بہرحال، 31 دسمبر 1974 کو درج شدہ بے روزگار افراد
کی تعداد 84 لاکھ 33 ہزار تھی۔

ہندوستان کے پسماندہ طبقے

ہندوستان کی تقریباً 20 فی صدی آبادی قبیلوں اور پسماندہ طبقوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ
لوگ ہیں جو روایتی نا اہلیت یا جغرافیائی اعتبار سے علیحدگی کی زندگی کی وجہ سے ہر اعتبار سے پچھڑے
ہوئے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ پسماندہ طبقوں میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لوگ،
خانہ بدوش یا اور دوسرے لوگ جن کی سالانہ آمدنی ایک مقررہ حد سے کم ہوتی ہے شامل
کیے جاتے ہیں 3 ہندوستان کے آئین میں پسماندہ طبقوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی ترقی کے
بارے میں ایک واضح پالیسی رکھی گئی ہے۔

1971 میں درج فہرست ذاتوں (شیڈولڈ کاسٹ) کے لوگوں کی تعداد 8 کروڑ اور درج فہرست قبیلوں (شیڈولڈ ٹرائبس) کے لوگوں کی تعداد 3 کروڑ 80 لاکھ تھی۔ مجموعی آبادی میں ان کا تناسب بالترتیب 14.6 اور 6.9 فی صدی تھا۔ شمالی ہند میں اترپردیش، بہار، مغربی بنگال، وسط ہند

گوشوارہ نمبر 20

ہندوستان میں پیشوں کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم 1971

زمرے	فی صدی		
	مرد	عورتیں	کل افراد
کل آبادی	51.82	48.18	100.00
کل کارکن	52.50	11.85	32.92
کسان	38.20	5.14	43.34
زرعی مزدور	17.57	8.76	26.33
دیگر زرعی کارکن	1.95	0.43	2.38
کان کنی	0.44	0.07	0.51
صنعت وحرفت	8.24	1.22	9.46
تعمیر	1.12	0.11	1.23
تجارت	5.26	0.31	5.57
نقل وحمل اور مواصلات	2.36	0.08	2.44
دیگر خدمات	7.50	1.24	8.74
خالی یا غیر فعال افراد	47.50	88.15	67.08

حوالہ ــــ انڈیا 1976، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 331

میں مدھیہ پردیش، اور جنوبی ہند میں تامل ناڈو اور آندھرا پردیش وہ علاقے ہیں جہاں پچھڑی ذات کے لوگ کثیر تعداد میں رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر صوبے میں کل تعداد کا کم از کم 7 فی صدی حصہ رہتا ہے۔ پنجاب، ہریانہ، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، اڑیسہ اور کیرالا ریاستوں میں ان کی چھدری تقسیم کے باوجود ہر صوبے میں کل تعداد کا 2 فی صدی سے زیادہ حصہ رہتا ہے۔

پچھڑے قبائلی لوگ زیادہ تر مدھیہ پردیش، بہار، اڑیسہ اور گجرات کی ریاستوں میں مرکوز ہیں۔ ان چاروں ریاستوں میں مجموعی طور پر تقریباً 58 فی صدی قبائلی لوگ رہتے ہیں۔ قبائلی آبادی کے لحاظ سے دیگر قابل ذکر ریاستیں آسام، مغربی بنگال، راجستھان، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش ہیں۔

ہندوستان میں آبادی کی دیہی اور شہری تقسیم

ہندوستان کے تقریباً 80 فی صدی افراد دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ 1971 کی مردم شماری کے لحاظ سے دیہات میں رہنے والوں کی تعداد 43 کروڑ 89 لاکھ تھی۔ تقریباً 10 کروڑ 91 لاکھ افراد شہری بستیوں میں رہتے تھے۔ اگرچہ شہری آبادی کا تناسب نسبتاً کم ہے تاہم اس کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے۔ 1971 میں شہری بستیوں کی کل تعداد 2641 تھی جب کہ دیہی بستیاں تعداد میں 575,721 تھیں۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی آبادی زیادہ تر دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ بہر حال شہری آبادی میں اضافہ بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس تیز اضافے کا اصل محرک اندرونی مہاجرت ہے نہ کہ پیدائش اور اموات کے واقعات۔ بہر حال شہری آبادی میں اضافہ بھی اپنی جگہ پر اہم اہم مسئلہ ہے۔

عام طور سے "شہری" آبادی کا مطلب اس بستی کی آبادی سے ہوتا ہے جس میں مندرجہ ذیل تین خصوصیات ہوں۔ (1) آبادی کم سے کم 5000 ہو۔ (2) آبادی کا گھنا پن کم سے کم 400 افراد فی مربع کلومیٹر (1000 افراد فی مربع میل) ہو۔ اور (3) جوان مردوں کی کم سے کم تین چوتھائی تعداد غیر زرعی کاموں میں مشغول ہو۔ اس کے علاوہ ان بستیوں کو بھی شہر تصور کیا جاتا ہے جو مخصوص انتظامیہ زمرے کے تحت آتی ہیں۔ چنانچہ میونسپل کارپوریشن، میونسپل ایریا، ٹاؤن ایریا کمیٹی، نوٹی فائڈ ایریا کمیٹی اور کینٹونمنٹ بورڈ کے زیر انتظام بستیوں کو شہر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ

ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ " دیہی آبادی " کُلی طور پر " زرعی آبادی " نہیں ہوتی، کیونکہ ہندوستان میں تقریباً 17 فی صدی دیہی افراد غیر زرعی کاموں سے روزی حاصل کرتے ہیں۔

1971 میں ہندوستان کی شہری آبادی کُل آبادی کا 19.9 فی صدی تھی۔ 1961 میں یہ فی صدی 18 تھی۔ اس میں سے صرف 14 فی صدی آبادی 20 ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کی بستیوں میں رہتی ہے اور 8 فی صدی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آبادی کی بستیوں میں۔ 1971 میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آبادی والے شہروں کی تعداد 147 تھی۔ سب سے زیادہ تعداد ان شہروں کی تھی جو 10,000 سے 19,999 کے زمرے میں آتے ہیں۔ تقریباً 173 شہر ایسے بھی تھے جن کی آبادی 5000 سے کم تھی۔ اتر پردیش میں 22 شہروں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ تعداد تمام دوسرے صوبوں کے مقابلے میں برتر تھی۔ ہندوستان کے نو شہر ایسے تھے جن کی آبادی 10 لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان میں کلکتہ (70,31,382)، بمبئی (58,78,575)، دہلی (36,47,023)، مدراس (31,69,930)، حیدرآباد (17,96,339)، احمد آباد (17,41,522)، بنگلور (16,53,779)، کانپور (12,75,242) اور پونے (11,35,034) شامل تھے۔

ہندوستان کی 80.1 فی صدی دیہی آبادی چھوٹے یعنی کم آبادی والے گاؤوں میں ملتی ہے۔ 1971 میں بڑے گاؤوں یعنی 10000 سے زائد آبادی والی دیہی بستیاں پورے ہندوستان میں صرف 1358 تھیں۔ سب سے زیادہ تعداد ان گاؤوں کی تھی جن کو 500 سے کم آبادی کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ گاؤں (1,12,561) اتر پردیش میں ہیں۔ اس کے بعد مدھیہ پردیش (70,883) اور بہار (67,566) کا نمبر آتا ہے۔ کیرالا اور تامل ناڈ صوبوں کی دیہی بستیاں زیادہ تر بڑی ہیں۔ کیرالا میں 10,000 اور اس سے زیادہ آبادی والے گاؤوں 808 ہیں اور اس زمرے میں اتنی بڑی تعداد کسی اور صوبے میں نہیں ملتی۔

ہندوستان میں دیہی آبادی کا تناسب بتدریج کم ہو رہا ہے (گوشوارہ نمبر 22)۔ 1901 میں یہاں دیہی آبادی 88.2 فی صد تھی جو 1971 میں 80.1 فی صد رہ گئی۔ اس کے برخلاف دیہی آبادی میں مجموعی اضافے کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس شرح میں اضافہ کل آبادی کی شرح میں اضافے کے برابر ہے۔ 1911-21 کے علاوہ ہر دس سالہ مدت میں دیہی اضافہ مثبت رہا ہے۔ 1911-21 کا منفی اضافہ (1.3- فی صدی) اس زمانے کی مہلک بیماریوں اور قحطوں کے باعث تھا۔ 1941-51 میں شرحِ اضافہ میں کمی کی توجیہ 1947 میں ملک کی تقسیم

گوشوارہ نمبر 21

آبادی کے لحاظ سے ہندوستان میں شہری بستیوں کی تقسیم 1971

آبادی	تعداد
100000 اور زائد	147
50000 سے 99999 تک	185
20000 سے 49999 تک	582
10000 سے 19999 تک	875
5000 سے 9999 تک	680
5000 سے کم	173
کل تعداد	2641

حوالہ ــ انڈیا 1975، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 14

گوشوارہ نمبر 22

ہندوستان میں دیہی و شہری آبادی کا تناسب

(کل آبادی کی فی صدی)

سال	1921	1931	1941	1951	1961	1971
دیہی	88.8	88.0	86.1	82.7	82.0	80.1
شہری	11.2	12.0	13.9	17.3	18.0	19.9

گوشوارہ نمبر 23

آبادی کے لحاظ سے ہندوستان میں گاؤں کی تقسیم 1971

آبادی	گاؤوں کی تعداد
10000 اور زائد	1358
5000 سے 9999 تک	4875
2000 سے 4999 تک	35992
1000 سے 1999 تک	81908
500 سے 999 تک	152872
500 سے کم	318611
کل تعداد	575721

نوٹ ــــ کل تعداد میں منی پور کے وہ تین گاؤں بھی شامل ہیں جن کے بارے میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔

حوالہ ــــ انڈیا 1975 حکومت ہند، نئی دہلی، ص 13۔

اور بڑی تعداد میں مہاجرت سے کی جاتی ہے ۔ 1951 کے بعد اضافے کی شرح 20.6 فی صدی ہوگئی اور 71 - 1961 میں 21.9 فی صدی ۔ مردوں میں اضافے کی شرح شروع سے ہی زیادہ رہی ہے ۔ 11 - 1901 کے دوران مردوں میں اضافہ 6.7 فی صدی تھا اور عورتوں میں 6.1 فی صدی ۔ 71 - 1961 کے دوران مردوں میں 22.8 فی صدی کا اضافہ ہوا اور عورتوں میں 21.0 فی صدی کا۔

ہندوستان میں شہری آبادی میں اضافہ اور شہری بستیوں کا فروغ دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نسبتاً کچھ دیر سے شروع ہوا ہے ۔ اس تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اقتصادی ترقی دیر سے شروع ہوئی ہے ۔ سب سے پہلے قابل لحاظ اضافہ 21 - 1911 کے دوران ہوا ۔ اس سے پہلے دس سالوں میں شہری آبادی میں اضافے کی شرح " دیہی " اور " کل " آبادی میں اضافے کی شرحوں سے بھی کم تھی ۔ لیکن 1911 کے بعد سے شہری آبادی کے تناسب میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا ہے ۔ 1911 میں ہندوستان کی کل آبادی کا 10.3 فی صدی شہری تھا ۔ پچاس سال بعد یہ تناسب 18 ہوگیا اور 1971 میں تقریباً 20 ہوگیا ۔ مجموعی شہری آبادی 1901 میں تقریباً 2 کروڑ 58 لاکھ تھی ۔ پچاس سال بعد یہ تعداد دگنی سے زیادہ ہوگئی اور 1971 میں چار گنی سے بھی زیادہ ۔

موجودہ صدی کے نصف تک شہری آبادی میں اضافے کی شرح مسلسل بڑھتی رہی ۔ پھر 61 - 1951 کے دوران شرح میں کمی واقع ہوئی ۔ 71 - 1961 کے دوران اضافے کی شرح میں خفیف سی زیادتی ہوئی ۔ شہری آبادی میں زیادہ تر اضافہ مہاجرت کی وجہ سے ہوا ہے ۔ بہت سے دیہی لوگ شہروں میں آکر بس جاتے ہیں ۔ اس سے صحیح معنوں میں شہری ترقی کے بجائے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں ۔ شہری ترقی کی سست رفتاری کو بہت سی وجوہ سے منسلک کیا جاسکتا ہے ۔ ان میں صنعت و حرفت کی پسماندگی ، شہروں میں روزگار کی کمی ، دیہی علاقوں میں اقتصادی حالات کی بتدریج بہتری چند اہم اسباب ہیں ۔

اول درجہ کے شہر یعنی جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے ، کل شہری آبادی کے اعتبار سے 1931 سے زوال پذیر رہے ہیں ۔ 41 - 1931 کے دوران ہندوستان کی کل شہری آبادی کا 68 فی صدی اول درجہ کے شہروں میں رہتا تھا ۔ 51 - 1941 کے دوران تناسب کم ہوکر صرف 65 رہ گیا اور 61 - 1951 کے دوران صرف 44 فی صدی ۔ تناسب میں کمی کی وجہ بڑی شہری بستیوں کے مقابلے میں چھوٹی شہری بستیوں کا فروغ ہے اور اس عمل میں بھی وہی عناصر

کارفرما ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔
ہندوستان کے شہری علاقوں میں اضافے کی فطری شرح دیہی علاقوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شہری آبادی میں آدھے سے کچھ زیادہ اضافہ فطری اضافے کے باعث ہوا ہے اور بقیہ مہاجرین کی آمد سے۔ 51-1941 کے دوران تقریباً 90 لاکھ دیہی افراد نے شہروں میں آکر سکونت اختیار کی لیکن اس کے بعد کی دس سالہ مدت میں اس طور پر صرف 52 لاکھ افراد کا اضافہ ہوا 5 اگرچہ دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان اقتصادی اور سیاسی رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ ان دونوں کے درمیان آمدورفت کو روکا نہیں جاسکتا تاہم مستقل سکونت پر شاید پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ مگر اس امر میں بھی شدید شبہ ہے۔

ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب

ہندوستان کی تقریباً 30 فی صدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ اگرچہ اس تناسب میں 1881 سے 1971 تک پانچ گنا اضافہ ہوا ہے پھر بھی ان پڑھ لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ 1971 کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تقریباً 39.45 فی صدی مرد تعلیم یافتہ ہیں جب کہ عورتوں میں یہ تناسب 18.7 فی صدی ہے۔ عورتوں کا یہ تناسب دیہی علاقوں میں اور بھی کم ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی عورتوں میں سے صرف 13.2 فی صدی تعلیم یافتہ ہیں۔ مجموعی طور پر دیہی آبادی میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب کل آبادی سے کم (23.74 فی صدی) ہے جب کہ شہروں میں یہ تناسب بہت زیادہ ہے۔ شہری علاقوں میں تعلیم یافتہ عورتیں 42 فیصدی ہیں جب کہ مردوں کا تناسب 61 فی صدی ہے۔
ہندوستان کے شعبۂ مردم شماری نے "تعلیم یافتہ" کی ایک معیاری تعریف پیش کی ہے۔ ہر وہ شخص جو کوئی بھی زبان لکھ اور پڑھ سکتا ہے وہ "حروف شناس" یا تعلیم یافتہ تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کے لیے دونوں عمل یعنی پڑھنا اور لکھنا لازمی ہیں۔ سہولت کے لیے چار سال اور اس سے کم عمر کے بچوں کو ان پڑھ تسلیم کیا جاتا ہے خواہ انہوں نے اسکول جانا شروع کر دیا ہو اور پڑھ لکھ بھی سکتے ہوں 6
آزادی سے پہلے ہندوستان میں صرف 16 فی صدی افراد تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے

گوشوارہ نمبر 24

دیہی اور شہری علاقوں میں مردوں اور عورتوں کی بدلتی ہوئی تعداد

1901 سے 1971 تک

دیہی

سال	آبادی لاکھوں میں	فی صد آبادی	تبدیلی فی صدی میں		
			مرد	عورتیں	کل
1901	2125	89.2	—	—	—
1911	2261	89.7	+6.7	+6.1	+6.4
1921	2232	88.8	-1.1	-1.5	-1.3
1931	2455	88.0	+10.2	+9.8	+10.0
1941	2745	86.1	+11.9	+11.7	+11.8
1951	2986	82.7	+8.8	+8.8	+8.8
1961	3603	82.0	+20.8	+20.5	+20.6
1971	4389	80.1	+22.8	+21.0	+21.9

شہری

سال	آبادی لاکھوں میں	فی صد آبادی	تبدیلی فی صدی میں		
			مرد	عورتیں	کل
1901	258	10.8	—	—	—
1911	259	10.3	+2.4	-1.9	+0.4
1921	281	11.2	+9.8	+6.5	+8.3
1931	335	12.0	+19.6	+18.5	+19.1
1941	442	13.9	+32.5	+31.3	+32.0

(مسلسل)

1951	624	17.3	+39.2	+44.1	+41.4
1961	783	18.0	+27.4	+25.2	+26.4
1971	1091	19.9	+37.9	+38.5	+38.1

حوالہ ـــ 1961 تک اعداد و شمار جی ، بی ، سکسینا ، " انڈین پاپولیشن ان ٹرانزیشن " ، نئی دہلی ، 1971 ، ص 66 سے ماخوذ ہیں ۔

بعد 1951 تک کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا لیکن 1961 میں یہ تعداد 24 فی صدی اور 1971 میں 29.45 فی صدی ہوگئی ۔ 1971 کی مردم شماری کے مطابق تعلیم یافتہ افراد کا سب سے زیادہ تناسب (60.4 فی صدی) کیرالا میں تھا ۔ اس کے بعد تامل ناڈ اور مہاراشٹر صوبوں کا نمبر تھا جن میں مذکورہ تناسب بالترتیب 39.46 اور 39.18 تھا ۔ مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں چنڈی گڑھ سب سے آگے تھا جہاں کا تناسب 61.56 فی صدی تھا ۔ اروناچل پردیش ، دادر اور ناگر حویلی کو چھوڑ کر مرکز کے زیر انتظام تمام علاقے تعلیم میں بہت آگے تھے ۔ بہار ، جموں اور کشمیر ، راجستھان ، سکم ، اروناچل پردیش ، دادرا اور ناگر حویلی میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب سب سے کم (20 فی صدی سے بھی کم) تھا ۔

اضلاعی سطح پر تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف ہے ۔ بیشتر خطے جن میں کے تناسب ملک کے اوسط سے زیادہ ہے ، ساحلی اور ان سے ملحقہ علاقوں میں واقع ہیں ۔ اوسط سے کم حیثیت کے خطے زیادہ تر ملک کے اندرونی حصوں میں ملتے ہیں ۔ ساحلی اور ان سے ملحقہ علاقوں میں تعلیم کی فروغ کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں ؟ (1) ان علاقوں میں کافی عرصے سے بیرونی افراد کی آمد رہی ہے اور خاص طور پر عیسائی مشنریوں نے لوگوں میں تعلیم کا کافی پرچار کیا ہے ۔ (2) ان علاقوں میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے بہت پہلے قائم ہو گئے تھے ۔ (3) ان علاقوں میں شہری آبادی کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے اور سمندر کے ذریعے مواصلاتی نظام نسبتاً زیادہ بہتر رہا ہے ۔

اگر چہ تعلیم یافتہ افراد کے تناسب میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے پھر بھی ان پڑھ لوگوں کی تعداد جو 1961 میں 33 کروڑ 4 لاکھ تھی 1971 میں بڑھ کر 38 کروڑ 60 لاکھ ہو چکی تھی ۔ اس کا سبب کل آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہے ۔ ان پڑھ طبقے میں زیادہ تر دیہی آبادی کے افراد

اور خاص طور پر عورتیں شامل ہیں ۔ عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا سب سے زیادہ رجحان کیرالا میں ہے ۔ 1971 میں یہاں 54.3 فی صدی عورتیں تعلیم یافتہ تھیں ۔ تامل ناڈو اور مہاراشٹر میں یہ تناسب بالترتیب 26.86 اور 26.43 فی صدی تھا ۔ مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں چنڈی گڑھ سب سے آگے تھا اور یہاں تعلیم یافتہ عورتوں کا تناسب 54.35 فی صدی تھا ۔ اڑیسہ ، ہریانہ ، مدھیہ پردیش ، اتر پردیش ، بہار ، راجستھان ، جموں اور کشمیر ، سکم ، اروناچل پردیش ، دادرا اور ناگر حویلی میں تعلیم یافتہ عورتوں کا تناسب سب سے کم تھا ۔ ان تمام علاقوں میں 85 فی صدی سے زیادہ عورتیں ان پڑھ تھیں ۔

1948 سے پہلے ہندوستان میں تعلیم سے متعلق کوئی ایسی ہمہ گیر پالیسی نہیں تھی جس کی رو سے تعلیمی سہولتیں سارے ملک میں بہم پہنچ سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے پہلے تعلیم یافتہ افراد کے تناسب میں علاقائی فرق بہت زیادہ تھے ۔ اب علاقائی تناسبوں میں تھوڑی بہت یکسانیت آتی جا رہی ہے [8] کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کی بنا پر حکومت کی پالیسی تعلیم پھیلانے پر زور دے رہی ہے ۔ اس پالیسی میں سب سے اہم نکتہ 14 سال تک کی عمر کے بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم ہے ۔

ہندوستان میں مذہب کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم

ہندوستان میں بہت سے مختلف مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں ۔ ان میں تعداد کے لحاظ سے چھ مذاہب سب سے اہم ہیں ۔ 1971 کی مردم شماری کے مطابق ہندو مذہب کے کے لوگوں کی اکثریت تھی اور ان کا تناسب کل آبادی کا 82.72 فی صدی تھا ۔ مسلمان کل آبادی کا 11.2 فی صدی تھے ۔ بقیہ 6 فی صدی میں عیسائی ، سکھ ، بدھ ، اور جین مذاہب کے لوگ تھے جن کے تناسب بالترتیب 2.6 ، 1.89 ، 0.71 اور 0.48 تھے ۔

ہندو مذہب کے لوگ پورے ہندوستان پر پھیلے ہوئے ہیں اور ملک کے زیادہ تر علاقوں میں ان کی اکثریت ہے ۔ علاقائی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کے دور افتادہ کچھ ہی علاقے ایسے ہیں جن میں ہندوؤں کا تناسب پورے ملک کے اوسط سے کم ہے ۔ یہ علاقے شمال مغربی ، شمالی ، اور شمال مشرقی اضلاع میں اور جنوب مغرب میں صوبہ کیرالا کے ساحلی منطقے میں پائے جاتے ہیں ۔ کیرالا کا ساحلی علاقہ بہت دنوں تک مسلم اور عیسائی مذاہب کے اثر میں

گوشوارہ نمبر 25

ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب (1971)

نوعیت	فی صدی
کل افراد	29.45
مرد	39.45
عورتیں	18.70
دیہی افراد	23.74
دیہی مرد	33.76
دیہی عورتیں	13.17
شہری افراد	52.44
شہری مرد	61.26
شہری عورتیں	42.14

حوالہ ــــ اے، چندر شیکھر، "سین سس آف انڈیا 1971"، جلد اول، انڈیا، حصہ دوم - اے (2)،
(یونین پرائمری سین سس ایبس ٹریکٹ) ص 24 واں -

گوشوارہ نمبر 26

ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگ

1881 سے 1971 تک

سال	تعلیم یافتہ افراد کا تناسب فی صدی میں		
	کل افراد	مرد	عورتیں
1971	29.3	39.5	18.4
1961	24.0	34.4	13.0
1951	16.7	24.9	7.9
1941	16.1	24.9	7.3
1931	9.5	15.6	2.9
1921	7.2	12.2	1.8
1911	5.9	10.6	1.1
1901	5.3	9.8	0.6
1891	5.6	10.4	0.5
1881	4.8	9.0	0.4

نوٹ ـــ 1881 سے 1941 تک اعداد و شمار ہندوستان کے ان علاقوں سے بھی متعلق ہیں جو آزادی کے بعد ملک کا حصہ نہیں ہیں۔

1971 کے اعداد فی صدی عارضی اعداد و شمار پر مشتمل ہیں۔ کل افراد، مرد اور عورتوں کے صحیح تناسب بالترتیب 29.45 ، 39.45 اور 18.70 ہیں۔

حوالہ ـــ ڈی۔ نٹ راجن، "ایکس ٹریکٹس فرام آل انڈیا سینسس رپورٹس آن لٹریسی"، سینسس آف انڈیا 1971۔

رہا ہے، چنانچہ بہت سی مقامی آبادی جن کے آباو اجداد ہندو تھے اب مسلمان یا عیسائی ہو چکی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے کئی اور سرحدی علاقے بیرونِ ملک سے آنے والے مختلف مذاہب کی تبلیغ کے زیر اثر آگئے ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے اندر بھی چند خطے ہندو اکثریت نہیں رکھتے، مثلاً آسام کی پہاڑیاں جہاں کے بسنے والے قبائلی تناسب میں ہندوؤں سے زیادہ ہیں۔

1971 میں مسلمانوں کی کل تعداد 6 کروڑ 14 لاکھ تھی۔ ریاستی سطح پر جموں اور کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کا تناسب 66 فی صدی ہے۔ دوسرا نمبر بہار کا ہے جہاں تناسب صرف 24.6 فی صدی ہے۔ سب سے کم تناسب (ایک فی صدی سے کم) پنجاب، ناگالینڈ اور ہندوستان کے چند مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں ملتا ہے۔ صوبائی تقسیم کے لحاظ سے مسلم آبادی کا سب سے زیادہ تناسب اتر پردیش میں ہے جہاں ہندوستان کی کل مسلم آبادی کا 22.26 فی صدی حصہ رہتا ہے۔ اس کے بعد مغربی بنگال (14.76 فی صدی) اور بہار (12.36 فی صدی) کا مقام ہے۔

اضلاعی سطح پر صورتِ حال یہ ہے کہ جموں اور کشمیر اور کیرالا صوبوں کے کئی اضلاع کثیر مسلم آبادی کے حامل ہیں۔ ان کو گنجان مسلم آبادی کے خطے کہا جا سکتا ہے۔ جموں اور کشمیر کے چار اضلاع (اننت ناگ، سری نگر، بارا مولا اور پونچھ) ایک خطہ بناتے ہیں۔ بارا مولا ضلع میں مسلم آبادی کا تناسب 96 فی صدی ہے جو پورے ملک میں اور کسی ضلع میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرا گنجان خطہ صوبہ کیرالا، خاص طور سے شمالی کیرالا ہے جہاں پورے صوبے کی تقریباً 66 فی صدی مسلم آبادی بستی ہے۔ شمالی حصہ میں مالا پورم، کوژی کوڈ، کنّانور اور پال گھاٹ اضلاع میں بھی مسلم اکثریت ہے۔ ضلع مالا پورم مسلم آبادی کا مرکز ہے جہاں مسلمانوں کا تناسب 64 فی صدی ہے۔ اس خطے کے جنوب مغرب میں لکش دیپ نام کے جزیرے واقع ہیں جہاں مسلم آبادی کا تناسب 94 فی صدی سے زیادہ ہے اگرچہ یہاں کی مجموعی مسلم آبادی بہت کم (تقریباً 30 ہزار) ہے۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے، تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ عیسائی صوبہ کیرالا میں رہتے ہیں۔ یہاں ان کا تناسب 22 فی صدی ہے۔ 1971 میں ہندوستان کے کل عیسائی آبادی ایک کروڑ 42 لاکھ تھی۔ ان میں سے تقریباً ایک کروڑ عیسائی دیہی علاقوں میں رہتے تھے۔ تامل ناڈ اور آندھرا پردیش میں بھی مجموعی عیسائی آبادی اچھی خاصی ہے۔

گوشوارہ نمبر 27

ہندوستان میں آبادی کی مذہبی تقسیم

مذاہب	کل آبادی میں تناسب فی صدی میں		آبادی لاکھوں میں	فی صد اضافہ
	1961[1]	1971	1971	1961-71[3]
ہندو	83.50	82.72	4534.4	23.69
مسلم	10.70	11.20	614.2	30.84
عیسائی	2.44	2.60	142.3	32.58
سکھ	1.79	1.89	103.8	32.28
بدھ	0.74	0.71	38.7	17.33
جین	0.46	0.48	26.0	28.49
دیگر[2]	0.37	0.40	22.2	19.59

(1) 1961 کے اعداد وشمار میں اروناچل پردیش شامل نہیں ہے کیونکہ اس سن میں وہاں مردم شماری نہیں ہو سکی تھی۔

(2) "دیگر" مذہب میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے مذہب کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

(3) ہر مذہب میں اضافہ علاقے کے رقبے کی ہم آہنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے دریافت کیا گیا ہے۔

حوالہ — انڈیا 1976، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 10۔

کرناٹک کا مغربی منطقہ، گوا، دمن اور دیو، اور مزورام میں بھی کافی عیسائی آبادی ہے۔
سکھوں کی تعداد 1971 میں ایک کروڑ سے زائد تھی۔ زیادہ تر سکھ پنجاب اور ہریانہ میں رہتے ہیں۔ کل سکھوں کا تقریباً 80 فی صدی صرف پنجاب میں مرکوز ہے۔ بدھ اور جین مذہبوں کے ماننے والوں کی تعداد 1971 میں بالترتیب 38 لاکھ اور 26 لاکھ تھی۔ لکش دیپ کو چھوڑ کر ہندوستان کا کوئی بھی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں ان دونوں مذہبوں کے لوگ کسی نہ کسی تعداد میں موجود نہ ہوں۔ بدھ مذہب ماننے والوں کی کثیر تعداد (85 فی صدی) صوبہ مہاراشٹر میں رہتی ہے۔ جین مت والوں کی سب سے بڑی تعداد مہاراشٹر، راجستھان اور گجرات میں ہے۔

حوالے

(1) جی، ٹی، تری وارتھا، " دی لیس ڈیولپنڈ ریلم "، نیویارک 1972، ص ص 81 - 389۔

(2) جی، ایس، گوسل، " پیشے کے لحاظ سے ہندوستان کی دیہی آبادی کی ساخت۔ ایک علاقائی تجزیہ " دی نیشنل جاگرفیکل جنرل آف انڈیا، جلد 4، ستمبر 1958، ص 140۔

(3) انڈیا 1976، حکومت ہند، نئی دہلی، ص 103۔

(4) اے، چندر شیکھر، " یونین پرائمری سینسس ایبس ٹریکٹ "، سینسس آف انڈیا 1971، جلد اول، انڈیا حصہ دوم اے (2)، ص 20 وال۔

(5) ڈی، جے، بوگ اور کے، سی، زکاریہ، " ہندوستان میں شہری آبادی کا فروغ اور مہاجرت "، مرتب کردہ ماسے ٹرنر، " انڈیاز اربن فیوچر "، برکلے، 1962، ص 31۔

(6) سابقہ حوالہ ۔۵، ص 25 وال۔

(7) جی، ایس، گوسل، " ہندوستان کی حرف شناسی کا تشریحی مطالعہ "، رورل سوشیولوجی، جلد 29، شمارہ 3، ستمبر 1964، ص 45۔ یہ حوالہ تری وارتھا کی کتاب (سابقہ حوالہ ۔۱، ص 394) سے منقول ہے۔

(8) سابقہ حوالہ ۔۱، ص 393۔

باب 9

آبادی میں اضافے کے محرکات

پیدائش اور موت زندگی کے دو ایسے اہم واقعات ہیں جن کا آبادی کی تعداد پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ آبادی کے اضافے میں پیدائش مثبت محرک اور موت منفی محرک ہے۔ علاوہ ازیں مہاجرت کا بھی آبادی کے اضافے پر اثر پڑتا ہے۔ عام طور پر مثبت محرکات کا اثر منفی محرکات کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہی حالت ہندوستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں کی آبادی میں اضافہ مثبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی تعداد میں اتنی بڑی ہے کہ خفیف سا شرح اضافہ بھی مطلق لحاظ سے بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہاں پیدائش کی شرح موت کی شرح سے کہیں زیادہ ہے۔ 70-1961 کی دس سالہ مدت کے دوران پیدائش کی شرح 41.1 فی ہزار تھی جب کہ موت کی شرح 18.9 فی ہزار تھی۔ یہی نہیں بلکہ موت کی شرح مسلسل کم ہو رہی ہے۔ 30-1921 کے دوران یہ 36.3 فی ہزار تھی، بعد ازاں 60-1951 کے دوران 22.8 فی ہزار، اور پھر 70-1961 میں 18.9 فی ہزار رہ گئی۔ آبادی میں اضافہ آبادی کی عمر اور جنس کے لحاظ سے ساخت کے باعث ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں کم عمر افراد کی بہتات ہے۔ 1971 میں 14 سال کی عمر تک کے بچوں کی تعداد 42 فی صدی، 15 سے 49 سال تک کے لوگوں کی تعداد 45.9 فی صدی، اور 50 سال اور زیادہ عمر کے لوگوں کی تعداد 12.1 فی صدی تھی۔ افزائش نسل کے اعتبار سے باصلاحیت لوگوں کی تعداد تقریباً 46 فی صدی تھی جو کہ بہرحال زیادہ ہے۔ اگرچہ بیرون ملک سے آنے والے مہاجرین کی مجموعی تعدلو کچھ بہت زیادہ نہیں ہوتی، تاہم اندرونی مہاجرت کے اثرات قابل لحاظ ہیں۔

ولادتیں اور افزائش نسل کی صلاحیت ــــ افزائش نسل کی صلاحیت کا اندازہ بچوں کی ولادتوں سے کیا جاتا ہے اور بچوں کی تعداد سے صلاحیت کی کمی یا زیادتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ عام عمرانیاتی نقطۂ نظر کے مطابق ایک مکمل طور پر باصلاحیت عورت وہ ہے جس کے اوسطاً 10

بچے ہوں۔ مخصوص حالات میں یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں ایک عورت کے اوسطاً چھ یا سات بچے ہوتے ہیں [1] شرح پیدائش سے بھی نسل کی افزائش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن یہ ایک "خام" طریقہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں پیدائش سے متعلق اعداد و شمار 1886 سے حاصل کیے جا رہے ہیں تاہم ملک کے مختلف حصوں میں اب بھی پیدائش کے تمام واقعات کا اندراج نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح اطلاعات حاصل کرنے کے لیے بالواسطہ طور پر مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

91 - 1881 کے دوران ہندوستان میں پیدائش کی خام شرح 48.9 فی ہزار افراد تھی۔ 1901 تک اس میں بتدریج کمی ہوتی رہی لیکن اس کے بعد 11 - 1901 کے دوران یہ شرح 49 فی ہزار سالانہ سے بھی زیادہ ہوگئی [2] اس وقت سے اب تک اس میں برابر کمی ہورہی ہے۔ 70 - 1961 کی دہائی میں پیدائش کی سالانہ شرح 41.1 تھی یعنی 1881 سے اب تک اس میں تقریباً 16 فی صدی کی کمی واقع ہوئی ہے، جس کو بہت معمولی سمجھنا چاہیے۔

1960 میں ہندوستان کی سات ریاستیں ایسی تھیں جن میں شرح ملک کے اوسط سے کم تھی۔ ان ریاستوں میں ملک کی تقریباً 56 فی صدی آبادی رہتی ہے۔ بقیہ 44 فی صدی آبادی میں پیدائش کی شرح ملک کے اوسط سے زیادہ تھی۔ آسام میں پیدائش کی شرح سب سے زیادہ (49.3 فی ہزار) اور تامل ناڈ میں سب سے کم (34.9 فی ہزار) تھی۔ تامل ناڈ اور کیرالا (38.9 فی ہزار) دونوں جنوبی صوبوں میں کم شرح پیدائش کی کوئی معقول توجیہ تو نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہی وہ دو صوبے ہیں جن میں جوان (15 سے 44 سال کی عمر کی) شادی شدہ عورتوں کا تناسب ہندوستان میں سب سے کم ہے۔ آسام، گجرات اور پنجاب میں پیدائش کی شرحیں سب سے زیادہ ہیں۔ ان تینوں صوبوں میں کسی قسم کی علاقائی وابستگی نہیں ہے۔ صرف آسام کے بارے میں ایک توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے، وہ یہ کہ وہاں مہاجرین کا "عنصر اثر انداز ہوا ہے، یعنی نوجوان افراد کی کثیر تعداد میں آمد زیادہ شرح پیدائش کا باعث ہے [3]

افزائشِ نسل کی صلاحیت کا زیادہ صحیح پتہ لگانے کے لیے مختلف عمری گروہوں کی عورتوں کی صلاحیت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مخصوص گروہوں میں شرح پیدائش سے متعلق اعداد و شمار 1961 سے پہلے ملک کے کچھ ہی علاقوں میں حاصل کیے گئے تھے۔ 1961 میں بھی صرف

نمونے کے طور پر اطلاعات حاصل کی گئیں تھیں لیکن یہ اطلاعات ملک کے تقریباً تمام علاقوں کے بارے میں بہت حد تک صحیح صورتِ حال کا پتہ دیتی ہیں۔ چنانچہ نیشنل سیمپل سروے کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ 20 سے 25 سال عمر تک کی عورتوں میں افزائشِ نسل کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس عمر کی فی ہزار عورتوں پر 264 بچوں کا اوسط ہے۔ 25 سے 30 سال کی عمر میں یہ اوسط 244 ہے۔ تاہم کچھ ماہروں کا خیال ہے کہ عورتوں میں افزائش نسل کی صلاحیت 25 سے 30 سال کی عمر میں کم نہیں ہوتی لیکن اس میں شماد اور وجوہ سے کمی آتا ہے۔

ازدواجی زندگی کے ادوار کے لحاظ سے پیدائشوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ ولادتیں شادی کے پانچ سال بعد سے دس سال تک ہوتی ہیں۔ گجرات کے شہری اور تامل ناڈ کے دیہی علاقوں میں 30 فی صدی ولادتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے والدین کی شادی ہوئے صرف 5 سے 10 سال کا عرصہ گزرا ہوتا ہے۔ عام طور پر 50 فی صدی سے زیادہ ولادتیں ان جوڑوں کے یہاں ہوتی ہیں جن کی شادی ہوئے 5 سے 15 سال کا عرصہ گزرا ہوتا ہے۔ شادی ہونے کے 25 سال کے بعد بہت کم ولادتیں ہوتی ہیں۔

ولادتوں کا مطالعہ بچوں کی ترتیب کے اعتبار سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک مقررہ وقت پر جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں زیادہ تناسب اولیں (پہلونٹی کے) بچوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے تیسرے اور اس کے بعد کے بچوں کا تناسب بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔ 61-1960 میں رجسٹرار جنرل آف انڈیا نے نمونے کے طور اس طرح کے آمار حاصل کیے تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دیہی اور شہری علاقے ترتیب وار پیدائش کی صلاحیت میں تقریباً برابر ہیں۔ تقریباً 60 فی صدی ولادتیں پہلے سے تیسرے بچے کی شکل میں ہوتی ہیں، 25 فی صدی چوتھے اور پانچویں بچے کی شکل میں اور اوسطاً 15 فی صدی چھٹے یا اس سے زیادہ کی شکل میں ہوتی ہیں۔

افزائشِ نسل کی صلاحیت کا مطالعہ آبادی کی طرزِ رہائش کے اعتبار سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان میں اختلافات زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ اس قسم کا فرق اصل میں ان ملکوں میں ملتا ہے جہاں مانع حمل اشیا کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں شہری لوگ دیہی لوگوں کے مقابلے میں مانع حمل اشیا کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر وہاں شہری علاقوں میں شرح پیدائش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ رجسٹرار

جنرل آف انڈیا کے زیر اہتمام ایک سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی دیہی اور شہری صلاحیتوں میں فرق آنے لگا ہے ۔ 1961 میں آٹھ صوبوں میں سے صرف راجستھان ہی ایسا صوبہ تھا جہاں شہری آبادی میں پیدائش کی شرح زیادہ تھی ۔ آج کل شرح پیدائش کم کرنے کی اجتماعی مہم چل رہی ہے تاہم اندازہ ہے کہ دیہی اور شہری فرق ابھی کافی عرصہ تک برقرار رہے گا ۔

اموات اور امکانی زندگی ـــــ 1970 کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں ہر سال ایک ہزار افراد میں سے 14 موت کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اموات کی شرح میں بتدریج کمی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ملک کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ موجودہ صدی کے پہلے دس سالوں کے دوران موت کی شرح 42.6 فی ہزار سالانہ تھی جو 70-1961 کے دوران صرف 18.9 رہ گئی تھی ۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز کمی بچوں کی شرح اموات میں ہوئی ہے ۔ اس سب کا براہ راست اثر امکانی زندگی پر پڑا ہے ، جو 30-1921 کے دوران تقریباً 26.7 سال تھی مگر 70-1961 میں تقریباً 41.4 سال ہو چکی تھی ۔

موت کی شرح میں کمی اصل میں حفظانِ صحت کے امور میں ایک انقلاب کا نتیجہ ہے ۔ آزادی کے بعد ملک میں طبی اداروں (میڈیکل کالج وغیرہ) کی تعداد 20 تھی جو بڑھ کر 1971 میں 94 ہو گئی ۔ اسی طرح ڈاکٹروں کی تعداد اور اسپتال وغیرہ کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ ہوا ہے ۔ ڈی ، ڈی ، ٹی کے چھڑکاؤ سے ملیریا پر بہت قابو پا لیا گیا ہے ۔ دق کی بیماری بھی بی ، سی ، جی کے ٹیکوں سے کنٹرول میں آ گئی ہے ۔ بڑی چیچک جیسی مہلک بیماری کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا ہے ۔ دور افتادہ دیہی علاقوں میں طبی خدمات کا کام بڑے پیمانے پر ہونے لگا ہے ۔ اس کے علاوہ امریکہ کی تکنیکی مدد اور عالمی تنظیم صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کی امداد و خدمات سے بھی ہندوستان بہت مستفید ہوا ہے ۔ ملیریا کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اگر آدمی اس سے بچ بھی جاتا ہے تو جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے اور نہ صرف دوسری بیماریاں اس پر غالب آنے لگتی ہیں بلکہ اس کی افزائش نسل کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ ملیریا جیسی بیماریوں کے ختم ہو جانے سے شرح اموات میں کمی کے ساتھ ساتھ انفرادی قوتِ مدافعت اور افزائشِ نسل کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا ہے ۔

اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ بہت عرصہ سے موت کی شرح میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے ۔ 30 - 1921 کی دہائی میں یہ شرح 36.3 فی ہزار سالانہ تھی ۔ اس کے بعد سے ہر

دس سالہ مدت میں یہ شرح 4 یا 5 کے حساب سے کم رہی - 70 - 1961 کے دوران موت کی شرح 18.9 فی ہزار تک گر چکی تھی۔ چونکہ جدید طبی ترقیاں صرف گذشتہ چند سالوں میں ہوئی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ محض جدید طبی ترقی ہی موت کی شرح میں کمی کا باعث نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان ابتدائی چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کا ہمہ گیر اثر نہ صرف ہندوستان کی معیشت پر بلکہ یہاں کی شرحِ اموات پر بھی پڑا ہے۔ مثال کے طور پر، یہاں ہر سال سیلاب اور اس کے اثرات سے بہت سے لوگ ہلاک ہوتے تھے۔ اب منصوبوں کے ذریعے سیلابوں کو کنٹرول میں لایا جارہا ہے چنانچہ اس قسم کی اموات میں کافی کمی ہوگئی ہے۔ نقل و حمل اور مواصلاتی نظام کی ترقی نے فوری طبی اور معاشی امداد کی فراہمی ممکن کردی ہے اور اس طور پر بھی شرح اموات میں کمی ہوتی جارہی ہے۔

علاقائی اعتبار سے شرح اموات میں نمایاں اختلافات نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے وسط شمالی، شمال مشرقی اور مغربی خطوں میں اموات کا تناسب نسبتاً زیادہ رہتا ہے۔ آسام، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش صوبوں میں شرح اموات ملک بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ ان کے صوبوں کے علاوہ بہار، اڑیسہ، آندھرا پردیش اور گجرات کے صوبے بھی ملک کے اوسط سے آگے ہیں۔ 61 - 1951 کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ آسام شرح اموات میں سب سے آگے تھا یعنی یہاں یہ شرح 26.9 فی ہزار تھی۔ اس شرح میں پچھلے دس سالوں میں تقریباً 15 فی صدی کی کمی ہوئی تھی۔ بہر حال سب زیادہ کمی مدھیہ پردیش میں واقع ہوئی تھی۔ یہ صوبہ 51-1941 میں شرح اموات میں ہندوستان میں اول نمبر پر تھا 4 جن علاقوں میں موت کی شرح نسبتاً کم ہے وہ زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں واقع ہیں۔ کیرالا میں موت کی شرح سب سے کم ہے۔ 51 - 1941 کے دوران یہاں کی شرح 18 اور 61 - 1951 کے دوران 16 فی ہزار تھی۔ کیرالا کے مشرق اور شمال مشرق میں واقع تامل ناڈ اور کرناٹک صوبوں میں اموات اوسط سے کم ہوتی ہیں اور تقریباً یہی صورتِ حال مہاراشٹر کی بھی ہے۔ شمالی ہندوستان میں صرف پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں 61 - 1941 کے دوران موت کے واقعات اوسط سے کم ہوتے تھے۔

1961 کے بعد ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کے بارے میں صحیح اعداد و شمار

حاصل کرنے کی کاوش تیز تر کی گئی ہے۔ زندگی کے اہم واقعات سے متعلق اعداد و شمار سیمپل (نمونہ) سروے کے ذریعے وقتاً فوقتاً حاصل کیے جاتے رہے ہیں۔ نیشنل سیمپل سروے کے مطابق اب ہندوستان میں موت کی شرح 12 اور 13 کے درمیان بتائی جاتی ہے [5] اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

ستمبر 1961 سے جولائی 1962	12.0	فی ہزار
جنوری 1963 سے فروری 1964	12.4	فی ہزار
جولائی 1964 سے جون 1965	13.0	فی ہزار
جولائی 1965 سے اگست 1966	12.2	فی ہزار

سیمپل رجسٹریشن اسکیم نے دیہی آبادی میں موت کی شرح کے تخمینے پیش کیے ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں [6]

1965 سے 1967	17.8	فی ہزار
1968	15.0	فی ہزار
1969 (جنوری سے جون)	15.4	فی ہزار

1968 میں ہندوستان کی دیہی آبادی میں موت کی اوسط شرح 15 فی ہزار سالانہ تھی۔ اوسط سے زیادہ شرح کے اعتبار سے اتر پردیش اور مدھیہ پردیش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ آسام میں بھی موت کی شرح اوسط سے زیادہ تھی لیکن اس کا شمار مذکورہ دو صوبوں کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں موت کی شرح اوسط شرح سے تقریباً 5.0 زیادہ تھی جب کہ ہندوستان کے پورے شمال وسطی حصہ میں یہ فرق 8.5 تھا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ 1968 میں دیہی شرح اموات کا علاقائی طرز عام شرح اموات کے علاقائی طرز سے قطعی مطابقت رکھتا تھا۔

شرح اموات کا مطالعہ عمر کے لحاظ سے بھی کیا جاتا ہے۔ مختلف عمری گروہوں میں شرح اموات سے امکانی زندگی کا تعین ہوتا ہے۔ کسی بھی جگہ کی آبادی کی عمر انیاتی ساخت اور موت کی موجودہ شرح پیدا ہونے والے بچوں کی اوسط امکانی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدائش کے وقت مردوں کی امکانی زندگی تقریباً 47 سال ہوتی ہے اور عورتوں کی 45.6 سال۔ جیسے جیسے آدمی کی عمر بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کی اپنی امکانی زندگی کی مدت بدلتی جاتی ہے۔ دس سال کی عمر تک زندہ رہنے والے افراد کے بارے میں اندازہ کیا جاتا ہے

کہ وہ مزید 48 سال زندہ رہ سکیں گے۔ اس کے بعد موت بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ 60 سال کی عمر میں مردوں کی امکانی زندگی 13 سال اور عورتوں کی 13.4 سال ہوتی ہے۔ 70-1961 کے دوران اس سلسلے میں قومی صورتِ حال پچھلی دس سالہ مدتوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔

1921 سے پہلے پیدائش کے وقت امکانی زندگی بہت کم تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس امکان میں بے قاعدگی بھی تھی، جس کی وجہ قحط، وبائی بیماریاں اور دوسری قدرتی وبائیں تھیں۔ 80 - 1872 کے دوران اوسط امکانی زندگی 24.6 سال تھی جس میں 1920 تک بتدریج کمی ہوتی چلی گئی تھی۔ 20 - 1911 کے دوران امکانی زندگی صرف 20.2 سال رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد سے اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اوسط کے لحاظ سے مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ دن زندہ رہتے ہیں۔ 30 - 1921 کے دوران مردوں کی امکانی زندگی 26.9 اور عورتوں کی 26.6 سال تھی جو 70 - 1961 کے دوران بڑھ کر بالترتیب 47.1 اور 45.6 ہوگئی ہے۔ عورتوں کی امکانی زندگی 30 سال کی عمر کے بعد مردوں کی امکانی زندگی کے برابر ہو جاتی ہے اور 40 سال کے بعد اس سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ دراصل عورتوں میں موت کے زیادہ واقعات زچگی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ 40 سال کی عمر کے بعد یہ خطرہ

گوشوارہ نمبر 28

ہندوستان میں موت اور پیدائش کی شرحیں

مدت	شرح پیدائش فی ہزار سالانہ	شرح اموات فی ہزار سالانہ
1921 - 30	46.4	36.3
1931 - 40	45.2	31.2
1941 - 50	39.9	27.4
1951 - 60	41.7	22.8
1961 - 70	41.1	18.9

حوالہ — انڈیا 1975، حکومتِ ہند، نئی دہلی، ص 8۔

گوشوارہ نمبر 29

ہندوستان میں پیدائش، اموات اور شیر خوار بچوں کی اموات کی شرحیں

(1901 سے 1970 تک)

سال	شرح پیدائش فی ہزار سالانہ	شرح اموات فی ہزار سالانہ	شیر خوار بچوں کی شرح اموات فی ہزار سالانہ
1901	34.6	29.6	202
1905	39.1	35.2	226
1910	39.5	31.9	212
1915	37.8	29.3	202
1920	33.0	30.6	195
1925	33.7	24.2	174
1930	36.0	26.9	181
1935	34.9	23.6	164
1940	32.0	21.1	160
1945	28.2	21.5	152
1950	24.9	16.1	127
1955	27.0	11.7	100
1960	21.2	9.7	89
1965	41.0	17.2	124
1970	39.0	14.0	113

نوٹ — 1950 سے پہلے کے اعداد و شمار کا تعلق ان علاقوں سے بھی ہے جو آزادی کے بعد سے ہندوستان میں شامل نہیں ہیں۔

حوالہ — ایس، چندر شیکھر، "انفینٹ مارٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا" لندن، 1972،

ضمیمہ 4، ص ص 342، 343۔

گوشوارہ نمبر 30

ہندوستان میں عمر کی مختلف منزلوں میں امکانی زندگی (سالوں میں)

عمر	1941-50		1951-60		1961-70	
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
0	32.5	31.7	41.9	40.6	47.1	45.6
10	40.0	39.5	45.2	43.8	49.0	48.1
20	33.0	32.9	37.0	35.8	40.2	39.7
30	26.6	26.2	29.0	27.9	31.9	31.7
40	20.5	21.1	22.1	22.4	24.7	24.7
50	14.9	16.2	16.5	17.5	18.3	18.9
60	10.1	11.3	11.8	13.0	13.0	13.4

حوالہ — انڈیا 1979، حکومتِ ہند، نئی دہلی، ص 8 ۔

گوشوارہ نمبر 31

ہندوستان میں پیدائش کے وقت امکانی زندگی

1872 سے 1971 تک

مدت	مرد	عورت
1872 - 80	23.67	25.58
1881 - 90	24.59	25.54
1891 - 1900	23.63	23.96
1901 - 10	22.59	23.31
1911 - 20	19.42	20.91
1921 - 30	26.91	26.56
1931 - 40	32.09	31.37
1941 - 50	32.45	31.66
1951 - 60	41.89	40.55
1961 - 70	47.10	45.60

حوالے — (1) رجسٹرار جنرل آف انڈیا، سینسس آف انڈیا، ایکچوریل رپورٹیں 1881، 1891، 1911 اور 1921۔

(2) انڈیا 1975 حکومت ہند، نئی دہلی، ۴ 8 -

گوشوارہ نمبر 32

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اموات کی شرحیں

دیہی، 1968

منطقہ	صوبہ	شرح
شمالی منطقہ	پنجاب	12.0
	راجستھان	18.5
	جموں اور کشمیر	17.5
وسطی منطقہ	اتر پردیش	23.5
	مدھیہ پردیش	23.4 [1]
مشرقی منطقہ	آسام	20.1
	بہار	15.0
	اڑلیسہ	15.3
	مغربی بنگال	13.5
جنوبی منطقہ	آندھرا پردیش	15.8
	کیرالا	10.0
	تامل ناڈ	16.0 [2]
	کرناٹک	13.3
مغربی منطقہ	گجرات	17.8
	مہاراشٹر	13.9

ع1 1967-68 کا تخمینہ

ع2 جولائی 1968 سے جولائی 1968 تک

حوالہ ــــ رجسٹرار جنرل آف انڈیا، سیمپل رجسٹریشن بلیٹن، شمارہ 39 - 35، نئی دہلی، مارچ، 1971، ص 2 - یہ حوالہ ایس، این، اگروالا، " انڈیاز پاپولیشن پرابلمز"، 1974، نئی دہلی ص 107 سے منقول ہے -

بالعموم دور ہو جاتا ہے ۔

بچوں کی اموات ـــــ عمرانیاتی اصطلاح میں ایک سال سے کم عمر بچے کو شیر خوار (Infant) کہا جاتا ہے ۔ شیر خوار بچوں کی اموات نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں ۔ ہندوستان میں پچاس سال تک کسی بھی عمر کے زمرے میں موت کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ شیر خوار بچوں میں۔ پچھلے 70 سالوں میں بچوں کی اموات کی شرحیں 100 اور 250 فی ہزار کے درمیان رہی ہیں ۔ اس دوران 1900، 9-1908 اور 1918 ایسے سال تھے جن میں بچوں کی اموات کی شرحیں سب سے زیادہ تھیں ۔ 1900 میں ہندوستان قحط سالی کا شکار تھا اور ناقص غذائیت سے سے وبائی بیماریاں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ۔ اسی وجہ سے اس سال بچوں کی شرح اموات 232 فی ہزار تھی ۔ پھر سات سال تک کمی واقع ہوتی رہی لیکن 9-1908 میں یکایک اضافہ ہوا اور شرح 246 ہوگئی ۔ 1908 میں تقریباً سارے شمالی ہندوستان میں ملیریا پھیلا ہوا تھا، جس کی وجہ سے بچوں کی اموات بہت زیادہ ہوئیں ۔ 1918 میں بچوں کی اموات کی شرح سب سے زیادہ (267) تھی ۔ یہ وہ سال تھا جب کہ انفلوئنزا کی عالمی وبا نے ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ چھوٹے بڑے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا ؟

1935 کے بعد سے بچوں کی شرح اموات میں بتدریج کمی ہو رہی ہے ۔ اس دوران صرف 1944 میں قحط بنگال کی وجہ سے کچھ اضافہ ہوا تھا ۔ 1900 سے 1952 تک بچوں کی شرحِ اموات (232 سے 116) میں پچاس فی صدی کی کمی ہوگئی تھی ۔ 70-1966 کے دوران بچوں کی شرحِ اموات 113 فی ہزار سالانہ تھی جس میں مسلسل کمی ہو رہی ہے ۔

آبادی میں اضافے کی کچھ دوسری وجوہ ـــ (1) ہندوستان میں شادی کو ایک مذہبی حرمت حاصل ہے ۔ یہاں دیر سویر زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں شادی کرنا لازمی سا تصور کیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ عام طور پر شادی کرنے والے مرد یا عورت کی اپنی پسند کو زیادہ دخل نہیں ہوتا ۔ اس لیے شادی کے معاملے میں اقتصادی یا جذباتی حالات زیادہ مانع نہیں ہوتے ۔ کم عمر میں شادیوں کا رواج اب بھی بہت زیادہ ہے لیکن بچوں کی شادیاں 1929 میں سارداایکٹ بن جانے کے بعد سے تقریباً بالکل ختم ہوگئی ہیں ۔ 1971 کے اعداد و شمار کے لحاظ سے شادی شدہ مردوں کی تعداد 11 کروڑ 79 لاکھ تھی ۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جن کی شادیاں کم عمری میں ہوئی تھیں ۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے شادی کا سلسلہ دس سال کی عمر سے ہی شروع

ہوجاتا ہے ۔ شادی شدہ عورتوں کی تعداد 1971 میں 12 کروڑ 5 لاکھ تھی اور زیادہ تر شادیاں 10 سے 14 سال کی عمر میں ہوئی تھیں ، گوکہ قانونی اعتبار سے مقررہ کم سے کم عمر عورتوں کے لیے 15 سال اور مردوں کے لیے 18 سال تھی ۔ اندازہ ہے کہ کم عمری کی شادیوں پر مختلف قانونی پابندیوں کا کافی اثر پڑا ہے ۔ پوری آبادی کی عورتوں کا اوسط لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں شادی کے وقت کی کم سے کم عمر 13 سال سے بڑھ کر 16 سال ہوگئی ہے 8 اپریل 1976 میں ہندوستان کی آبادی سے متعلق ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا ، جس کے تحت شادی کی کم سے کم عمر مردوں کے لیے 18 سال سے بڑھاکر 21 سال ، اور عورتوں کے لیے 15 سال سے بڑھاکر 18 سال کر دی گئی ہے ۔ لہٰذا توقع ہے کہ اب نسبتاً زیادہ عمر کے شادی شدہ جوڑے افزائش نسل کے بارے میں زیادہ ذمہ داری اور سوجھ بوجھ سے کام لیں گے ۔

(2) ہندوستان میں خصوصاً ہندو سماج میں ، ایک دقیانوسی عنصر یہ تھا کہ یہاں بیواؤں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں ۔ اس سماج پابندی کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے دس سالہ وقفے میں تقریباً 2 کروڑ 32 لاکھ عورتیں ایسی تھیں جو بیوہ ہونے کے بعد عموماً شادی نہیں کرتیں ۔ ان بیواؤں میں 20 ہزار وہ کنواری بیوائیں بھی شامل تھیں جن کی شادیاں بچپن میں ہوگئی تھیں ۔ بہرحال اب ملک میں اہم سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ رویہ بدل رہا ہے ۔ اب کنوارے اور رنڈوے بیواؤں سے شادی کرنے لگے ہیں ۔ اگرچہ یہ تبدیلی سماج کی بہتری کی ایک علامت ہے تاہم یہ امر کہ اب بیواؤں کی شادی ہونے لگی ہے اضافہ آبادی میں ایک مزید عنصر ہے ۔

(3) ہندوستان کی 80 فی صدی آبادی گاؤں میں رہتی ہے ۔ پچھلے چند سالوں میں دیہی آبادی اور شہری آبادی کے تناسب میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ 1921 میں دیہی آبادی 88.8 فی صدی تھی جو 1971 میں گھٹ کر 80.1 رہ گئی ۔ تاہم دیہی آبادی کی اکثریت برقرار رہے اور مستقبل قریب میں اس میں کسی کمی کی توقع نہیں ہے ۔ دیہی معیشت تقریباً کلی طور پر زرعی مزدوروں پر منحصر ہوتی ہے ۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ہر کسان کو زیادہ سے زیادہ بیٹوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ ضرورت "سبز انقلاب" کے بعد بھی برقرار ہے کیونکہ زراعت کے قدیم روایتی نظام میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے ۔ جب تک کہ زرعی نظام جدید مانیکی طرز کا نہیں ہوجائے گا اس وقت تک زرعی مزدوروں کی ضرورت اسی طرح برقرار رہے گی ۔ اس

کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ کسانوں کو موجودہ سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی ایسا تحفظ حاصل نہیں ہے کہ ان کے بڑھاپے میں ان کی گزر بسر کا انتظام ہو سکے۔ اس لیے ہندوستانی کسان ہمیشہ سے نر اولادوں کا خواہشمند رہا ہے، تاکہ وہ اس کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کر سکے، اس کی خواہش کے مطابق خاندان چلا سکے اور اس کے مرنے کے بعد ان کے کھیتوں اور دوسری املاک کا وارث بن سکے۔ کسانوں کی اس دیرینہ خواہش کا اضافۂ آبادی میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔

(4) ہندوستان کا سیاسی استحکام بھی کچھ حد تک آبادی میں اضافے کا ذمہ دار ہے۔ آزادی کے بعد سے یہ عظیم ملک ہر قسم کے فوجی انقلاب اور خانہ جنگی سے محفوظ رہا ہے اور یہاں کے جمہوری اور پارلیمانی نظام نے سماجی استحکام کی وہ صورت پیدا کردی ہے جو اضافۂ آبادی کے لیے سازگار ثابت ہوئی ہے۔

(5) اضافۂ آبادی میں خاطر خواہ کمی واقع نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دور افتادہ دیہی علاقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام بہت کم پہنچا ہے۔ فیملی پلاننگ کو سرکاری پروگرام کی حیثیت 1952 میں حاصل ہوگئی تھی، لیکن کہیں 1966 میں جاکر اس کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے میں 5 ارب 16 کروڑ روپے کنبہ بندی کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ اس سے قبل پہلے پنج سالہ منصوبے میں یہ رقم 14 لاکھ تھی، دوسرے میں 2 کروڑ 15 لاکھ تیسرے میں 24 کروڑ 86 لاکھ اور چوتھے میں 2 ارب 80 کروڑ 36 لاکھ روپے تھی۔ چنانچہ اس پروگرام کی توسیع اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان میں شرح پیدائش جو 1969 میں 39 فی ہزار تھی گھٹ کر پانچویں پنج سالہ منصوبے کے آخر تک 30 فی ہزار ہوجائے گی۔

اندرونی مہاجرت ـــــ جیسا کہ کہا جا چکا ہے آبادی میں اضافہ مہاجرت سے بھی ہوتا ہے۔ مہاجرت یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے عمل سے دو مقامات متاثر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس جگہ سے لوگ ہجرت کرتے ہیں وہاں کی آبادی میں کمی اور جس جگہ جاکر سکونت اختیار کرتے ہیں وہاں کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اضافۂ آبادی پر مہاجرت کا اثر پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہ پیچیدگی مہاجرین کی خصوصیات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ زیادہ تر ہجرت ایک مخصوص عمر اور ایک مخصوص جنس کے افراد ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا مہاجرت سے متاثر مقامات محض تعدادی اعتبار سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ وہاں

کی آبادی کی ساخت میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مہاجرین کی تعداد کا مجموعی آبادی میں تناسب بھی ایک اہم بات ہے۔ کروڑوں کی آبادی رکھنے والے ملک میں چند ہزار یا لاکھ مہاجرین کا تناسب کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اسی لیے ہندوستان میں بین اقوامی مہاجرت کا مجموعی آبادی کے اضافے پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اندرونی مہاجرت سے آبادی کی علاقائی ساخت میں قابل ذکر تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ ہندوستان کی تقریباً 30 فی صدی دیہی اور 42 فی صدی شہری آبادی ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی جائے پیدائش چھوڑ کر کہیں اور سکونت اختیار کرلی ہے، یعنی ہندوستان کے تقریباً 32 فی صدی افراد اندرونی مہاجر ہیں۔ اس اندرونی مہاجرت کا مطالعہ ان کی قسموں کے لحاظ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً رہائشی اعتبار سے مہاجرت کی چار قسمیں کی جاسکتی ہیں: (1) دیہات سے دیہات کو (2) دیہات سے شہر کو (3) شہر سے دیہات کو اور (4) شہر سے شہر کو۔

1961 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں اندرونِ ملک مہاجروں کی کل تعداد 13 کروڑ 53 لاکھ تھی۔ 1971 میں اس تعداد میں 2 کروڑ 48 لاکھ کا اضافہ ہوا۔ ان میں سے تقریباً 70 فی صدی افراد وہ تھے جنھوں نے ایک دیہات سے دوسرے دیہات کو مہاجرت کی تھی۔ دیہی علاقوں کے مابین ہونے والی مہاجرت میں عورتوں کا تناسب مردوں کے تناسب کا تقریباً تین گنا تھا۔ تعداد کے اعتبار سے ایک دیہی علاقے سے دوسرے دیہی علاقے کو جانے والے 1961 میں 9 کروڑ 90 لاکھ تھے اور 1971 میں بڑھ کر 11 کروڑ 30 لاکھ ہوگئے تھے۔ اس ضمن میں عورتوں کی تعداد 7 کروڑ 60 لاکھ سے بڑھ کر 8 کروڑ 70 لاکھ ہوگئی تھی۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی مہاجرت میں تقریباً 50 فی صدی حصہ ان عورتوں کا ہوتا ہے جو دیہات سے دیہات کو مہاجرت کرتی ہیں۔ اس مہاجرت کا سب سے بڑا سبب شادی ہے۔

دیہی علاقوں سے شہری علاقوں کو مہاجرت 71 - 1961 کے دوران اتنی تیزی سے نہیں بڑھی جتنی کہ اس سے پہلے بڑھی تھی۔ 1961 میں شہروں میں آکر بسنے والے دیہی افراد کی تعداد 1 کروڑ 96 لاکھ تھی۔ 1971 تک اس تعداد میں 41 لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس مہاجرت میں جنسی تناسب میں زیادہ فرق تو دیکھنے میں نہیں آتا لیکن مردوں کا تناسب قدرے زیادہ رہتا ہے۔

ایسے مہاجر جو شہروں سے جاکر دیہاتوں میں بستے ہیں تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔ 1961 میں اس طرح کے مہاجر تقریباً 50 لاکھ تھے جو 1971 میں بڑھ 80 لاکھ ہوگئے تھے۔ اس

سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ 71-1961 کے دوران شہروں سے دیہاتوں کی طرف جانے یا لوٹنے والوں کی آبادی میں اضافہ ہندوستان کی مجموعی آبادی میں اضافے سے کہیں زیادہ تھا حالانکہ مجموعی تعداد اتنی اہم نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس مہاجرت میں عورتوں کا تناسب تقریباً دگنا تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں اس جدید رجحان کی وجہیں تو بہت سی ہوسکتی ہیں سب سے اہم وجہ شاید یہ ہے کہ گاؤں کی اقتصادی حالت بہتر ہورہی ہے اور دیہی ترقی کے لیے یہ ایک خوش آیند بات ہے۔ کچھ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ دیہات میں مزدور طبقے میں اضافہ اس وقت تک خوش آیند نہیں ہوسکتا جب تک ان کے لیے زراعت کے علاوہ اور کاروبار کا انتظام نہیں ہوجاتا اس لیے دیہاتوں میں صرف مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے زراعت میں اضافہ نہیں ہوگا۔ مزدوروں کی زیادہ تعداد کو فاضل تعداد سمجھنا چاہیے اور ان کے لیے زراعت پر مبنی صنعتیں اور دوسرے کام کاج پیدا کرنے چاہئیں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاکر بسنے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ 1961 میں اس طرح کے لوگوں کی تعداد 1 کروڑ 8 لاکھ تھی جو 1971 میں 14 کروڑ ہوگئی تھی۔ 1961 میں عورتوں اور مردوں کا تناسب برابر تھا لیکن 1971 میں عورتوں کا تناسب مردوں کے تناسب سے تجاوز کرگیا تھا۔

ہندوستان میں بین صوبہ جاتی مہاجرت کا اثر دیہی علاقوں پر منفی اور شہری علاقوں پر مثبت پڑا ہے۔ 1961 میں مذکورہ مہاجرت سے دیہی آبادی میں کمی (12 فی ہزار کی شرح سے) ہوئی تھی۔ 1971 میں دیہی آبادی کے کم ہونے کی شرح 10 فی ہزار ہوگئی تھی۔ دوسری طرف شہری آبادی میں مجموعی طور پر اضافہ ہوا تھا جس کی شرحیں 1961 اور 1971 میں بالترتیب 55 اور 43 فی ہزار تھیں۔ اعداد و شمار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ 1971 میں اس مہاجرت کا اضافہ آبادی پر اتنا اثر نہیں تھا جتنا دس سال پہلے تھا۔

سب سے زیادہ مہاجروں کی تعداد "اندرون ضلع" مہاجروں کی ہے، اس کے بعد "بین اضلاع" اور "بین صوبہ جات" مہاجروں کا نمبر آتا ہے۔ بین صوبہ جات مہاجرت کی شرح ہر صوبے میں یکساں نہیں ہے۔ یہ غیر یکسانیت ان گوناگوں محرکات کے باعث ہے جو مہاجرت کو متاثر کرتے ہیں۔ 71-1961 کے دوران مہاجرت کی شرحوں کے مطالعے سے یہ

گوشوارہ نمبر 33

ہندوستان میں بین صوبہ جات مہاجرت کی شرح

(1961 اور 1971)

صوبہ جات	دیہی				شہری			
	مرد		عورت		مرد		عورت	
	1961	1971	1961	1971	1961	1971	1961	1971
آندھرا پردیش	12.9-	11.1-	8.2	7.7-	4.7	0.5	4.8	5.5
آسام اور میگھالیہ	34.5	27.0	17.5	13.9	134.6	125.5	28.5	28.0
بہار	45.3-	32.3-	15.4-	12.3-	15.9	6.1	37.2	19.4
گجرات	17.3-	13.5-	11.5-	11.8-	11.8	33.9	5.7-	11.5
جموں و کشمیر	14.6-	4.1	4.7-	1.7	33.3-	16.0-	22.8-	19.0
کیرالا	21.8-	24.2-	5.5-	9.4-	98.9-	118.2-	53.8-	77.8-
مدھیہ پردیش	6.4	5.2	4.80	3.4	124.6	107.2	88.7	83.7
مہاراشٹر	1.90-	0.5-	2.3-	1.9-	185.9	164.2	119.8	107.9
کرناٹک	2.5	1.7-	0.4-	0.8-	47.7	20.2	35.9	10.5
اڑیسہ	19.0-	3.7-	6.0-	3.2	57.2	70.7	62.9	83.5
پنجاب[2]	37.2-	31.8-	21.4-	16.6-	7.8-	19.3	31.4-	4.8-
راجستھان	27.7-	25.8-	20.6-	16.2-	23.5-	19.1-	19.0-	15.8-
تامل ناڈ	23.5-	15.2	19.2	9.9-	4.1	10.1	0.8	4.6
اتر پردیش	30.0-	30.7-	9.4-	11.5-	27.1-	45.4-	8.7-	27.2-
مغربی بنگال	18.2	9.0	4.1	2.2	208.5	125.6	80.6	34.7
ہندوستان	15.9-	13.2-	7.3-	6.0-	70.0	54.9	37.5	29.1

ع1 مذکورہ مہاجرت کی شرح کا مطلب دس سالہ مدت کے دوران "خالص مہاجرت کی شرح" سے ہے جس کا طریقہ درج ذیل ہے:

مہاجرت کی شرح = {(آنے والے مہاجرین 1971) - (جانے والے مہاجرین 1971)} - {(آنے والے مہاجرین 1961) - (جانے والے مہاجرین 1961)} / (کل آبادی 1971)

ع2 پنجاب میں صوبہ پنجاب کے علاوہ ہریانہ، ہماچل پردیش اور چنڈی گڑھ بھی شامل ہیں۔

نوٹ: نفی کی علامت والی شرحیں معینہ صوبے میں جانے والے مہاجرین کی زیادہ تعداد کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

حوالہ: جی، کے، مہوترا، "برتھ پلیس مائگریشن ان انڈیا"، سینسس آف انڈیا 1971 نئی دہلی، 1974، صفحہ 228 (حصہ اول)، 3 اور 22 (حصہ دوم)۔

بات قطعی واضح ہے کہ مہاجر عورتوں کی شرحیں مہاجر مردوں کی شرحوں کے مقابلے میں کم تھیں۔ 1971 میں دیہی علاقوں میں طرزِ مہاجرت 1961 کے مانند تھی لیکن شہری علاقوں میں گذشتہ دس سالوں میں کافی تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ کچھ علاقوں کو چھوڑ کر زیادہ تر دیہی علاقوں میں جانے والے مہاجرین کی تعداد زیادہ تھی یعنی معینہ صوبوں کی دیہی آبادی کے اضافے پر مہاجرت کا منفی اثر ہوا تھا۔ دوسری طرف شہری علاقوں میں آنے والے مہاجرین تعداد میں زیادہ تھے یعنی وہاں کے اضافۂ آبادی پر مہاجرت کا مثبت اثر پڑا تھا۔

حوالے

(1) ایس، این، اگروالا، "انڈیاز پاپولیشن پرابلمز" 1974، نئی دہلی، ص 16۔

(2) کنگس لے ڈیوس، "پاپولیشن آف انڈیا اینڈ پاکستان"، پرنسٹن، 1951، ص 85۔

(3) ایس، پی، جین، "اسٹیٹ گروتھ ریٹس اینڈ دیر کمپونینٹس"، مولف اشیش بوس، "پیٹرنز آف پاپولیشن چینج ان انڈیا، 1951-61"، نیویارک، 1967، صص 30-26۔

(4) رجسٹرار جنرل آف انڈیا، "وائٹل اسٹیٹسٹکس آف انڈیا فار 1961"، نئی دہلی، 1964، صص 40 اور 42۔

(5) سابقہ حوالہ 1، ص 106۔

(6) رجسٹرار جنرل آف انڈیا، سیمپل رجسٹریشن بلیٹن، شمارہ 39-35، نئی دہلی، مارچ، 1970، ص 2

(7) ایس، چندرشیکھر، "انفینٹ مارٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا"، لندن، 1972، ص 1382-130۔

(8) سابقہ حوالہ 1، ص 252۔

باب 10

اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل

یہ بات تو واضح ہے کہ دنیا کی آبادی میں اضافہ کی موجودہ رفتار انسانی ضروریات میں اضافہ کی رفتار سے زیادہ ہے۔ انسان کی ابتدائی ضروریات کھانے کے لیے غذا، پہننے کے لیے کپڑا اور سر چھپانے کے لیے مکان ہیں۔ یہ ابتدائی ضروریات تو اولین انسان نے وجود میں آتے ہی محسوس کی ہوں گی۔ اس کے بعد تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ ضروریات مادی بھی تھیں اور غیر مادی بھی۔ غیر مادی ضروریات کی ایک مثال تعلیم و تربیت ہے جو سماجی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ انسان کی زندگی جیسے جیسے بہتر ہو رہی ہے ویسے ویسے اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں انسانی آبادی میں مسلسل اضافہ کی وجہ سے ضروریات میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں یہ حالات اور بھی زیادہ تشویش ناک ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس امر کا تعین کیا جائے کہ مناسب تعداد کتنی ہونی چاہیے۔ پھر اس بات کی کوشش کی جائے کہ آبادی معینہ تعداد سے زیادہ نہ ہونے پائے، تاکہ معیار زندگی گرنے نہ پائے اور ملک سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے مستحکم رہے۔ ہندوستان میں زندگی کے معیار کو بہتر بنانے میں اضافۂ آبادی کی تیز رفتاری سب سے زیادہ مانع ہوئی ہے۔ اب بھی ہندوستان میں غربت اور پست معیار زندگی عام ہے اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوستان غریب ملک تو نہیں ہے لیکن غریبوں کا ملک ہے۔

کسی ملک کے معیار زندگی کا اندازہ مختلف امور سے لگایا جا سکتا ہے۔ غذا، پوشاک، رہائش، تعلیم و تربیت کے مواقع، حفظانِ صحت کے انتظامات، اور مختلف ثقافتی سرگرمیاں معیار زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں ان تمام چیزوں کے اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں تاہم ہندوستانی باشندوں کے معیار زندگی کا صحیح اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

ہندوستان میں ایک آدمی اوسطاً اپنی آمدنی کا تقریباً 80 فی صدی صرف غذا پر خرچ کرتا ہے

اور اس کے باوجود بھی زیادہ تر لوگوں کو دو وقت کھانا بھی میسر نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں ایک آدمی اوسطاً اپنی آمدنی کا تقریباً 30 فی صدی غذا پر خرچ کرتا ہے مگر اس غذا میں بہت کافی غذائیت ہوتی ہے۔ ہم جو غذا کھاتے ہیں جسم میں پہنچ کر کیمیاوی طور پر تحلیل ہوتی ہے اور اس کا کچھ حصہ توانائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس توانائی کا اندازہ کیلوری فی گرام کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غذائیت کے اعتبار سے "مناسب" غذا کا تعین کرنا ضروری ہے۔ یہ بات کہ مناسب یا متوازن غذا کیا ہونی چاہیئے ماحول اور افراد پر منحصر ہوتی ہے۔ جن جگہوں کی آب و ہوا گرم ہے اور سال بھر گرم رہتی ہے وہاں کم کیلوری کی غذا مناسب توانائی بخش سکتی ہے۔ اس کے برخلاف ٹھنڈی آب و ہوا والے علاقوں میں اور ٹھنڈے موسم میں زیادہ کیلوریاں درکار ہوتی ہیں۔ چھوٹی جسامت کے آدمی کو بڑی جسامت کے آدمی کے مقابلے میں کم کیلوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پیشہ، جنس اور عمر کے لحاظ سے بھی درکار غذائیت کی مقدار میں فرداً فرداً فرق ہوتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے فی کس فی روز کیلوری کی اوسط مقدار مندرجہ ذیل ہونی چاہیئے: 4 سے 6 سال عمر تک کے بچوں کے لیے 1600 کیلوریاں، 25 سال کے مردوں کے لیے 3200 کیلوریاں، اور 45 سال کے مردوں کے لیے 2900 کیلوریاں۔ ان ہی عمروں کی عورتوں کو نسبتاً کم کیلوریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ ایسے پیشوں میں ہیں جن میں زیادہ تر بیٹھے رہنا پڑتا ہے انھیں کسانوں یا کان کنوں کے مقابلے میں کم کیلوریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

فی کس فی دن میسر کیلوریوں کے لحاظ سے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول وہ علاقے جن میں ہر فرد کو بہت کافی کیلوریاں (اوسطاً 2900 سے زیادہ) حاصل ہوتی ہیں۔ ان علاقوں میں اٹلی اور پرتگال کو چھوڑ کر سارا یورپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، روس، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اور یوراگوے شامل ہیں۔ ان ملکوں میں پروٹین کا استعمال بھی کافی (80 گرام سے زیادہ) ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ علاقے ہیں جن میں کیلوری کا صرفہ 2500 سے 2900 تک اور پروٹین کا 60 سے 80 گرام تک ہے۔ ان میں لاطینی امریکہ کے زیادہ تر ممالک، جنوبی افریقہ کے کئی ممالک مصر، الجیریا، مراقش، گھانا، کینیا، منگولیا، سراواک اور ملیشیا شامل ہیں۔ تیسرا نمبر بقیہ ملکوں کا ہے جن میں جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ترقی پذیر ممالک آتے ہیں۔ یہاں روزانہ ہر آدمی کو اوسطاً 2500 سے کم کیلوری اور 60 گرام سے کم پروٹین

میسر ہوتی ہے ۔ ہندوستان کے زیادہ تر لوگ متوازن غذا سے محروم رہتے ہیں ۔ 1976 میں لگائے ہوئے ایک اندازے کے مطابق متوازن غذا کے انتہائی کفایت شعار نسخے کی قیمت بھی دو روپے سے کم نہیں پڑتی ہے ۔ اول تو ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ روزانہ یہ قیمت ادا کرنے سے قاصر ہے دوسرے اجناس کی ماہیت ، ان کا غلط استعمال اور ان میں ملاوٹ وغیرہ ناقص غذائیت کے مسئلہ کو اور بھی اہم بنا دیتے ہیں ۔

ہندوستان میں غذائی مقدار کی کل پیداوار 51 - 1950 میں 5 کروڑ 50 لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر 73 - 72 19 میں 9 کروڑ 52 لاکھ ٹن ہوگئی ۔ پھر بھی یہ مقدار ملک کی آبادی کی ضرورت کے مطابق نہیں تھی ۔ ایک تخمینے کے حساب سے ایک آدمی کو روزانہ تقریباً 18 اونس غذائی اجزا ملنے چاہئیں ۔ لیکن 73 - 1972 میں فی کس فی دن پیداوار 16.3 اونس تھی ۔ اس طرح ایک اوسط ہندوستانی کو اپنی ضرورت سے کم ہی غذا میسر آتی ہے ۔ یہ کمی غریب طبقے میں بہت ہی نمایاں ہے ۔ مختلف علاقائی تحقیقوں سے پتہ چلا ہے کہ ہندوستان میں ہر چار افراد میں سے ایک کم غذائیت کا شکار ہے اور دو کو ناقص کم غذا ملتی ہے ۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف 30 کروڑ افراد کو مناسب مقدار میں غذا میسر آتی ہے ۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے معاملے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے اور غذائی قلت کے علاوہ طبی اور تعلیمی سہولتیں اور روزگار کے مواقع بھی محدود ہو رہے ہیں ۔

آزادی کے بعد سے تعلیمی اداروں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے ۔ 1947 میں ہندوستان میں صرف 16 یونیورسٹیاں تھیں لیکن 1974 میں ان کی تعداد 95 ہوگئی تھی ۔ ان کے علاوہ کئی اور ادارے بھی ہیں جن کو یونیورسٹی سطح کا درجہ حاصل ہے ۔ پھر بھی موجودہ یونیورسٹیاں اور اس درجے کے دوسرے ادارے طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہیں ۔ چنانچہ ہر سال ہزاروں امیدوار ان اعلیٰ اداروں میں داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں ۔ 1951 سے 1972 تک یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد میں آٹھ گنے سے زیادہ اضافہ ہوا ہے ۔ کالجوں میں یہ اضافہ پانچ گنے سے زیادہ اور اسکولوں میں چار گنے کے قریب رہا ہے ، جب کہ اسی عرصہ میں اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں صرف ڈھائی گنا اضافہ ہوا ہے ۔ نتیجہ کے طور پر موجودہ کالجوں اور اسکولوں میں طلبا کی تعداد عام طور پر مقررہ تعداد سے بہت زیادہ ہے ، جو انتظامیہ کے لیے تو وبالِ جان ہوتی ہی ہے

لیکن اس کے علاوہ تعلیم کے معیار پر بھی برا اثر ڈالتی ہے ۔ مجموعی اعتبار سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد 1951 میں 16.6 سے بڑھ 1971 میں 29.45 فی صدی ہو گئی تھی ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ رفتار ایک تعلیم یافتہ سماج کا خواب پورا نہیں کر سکتی ۔

کسی بھی ملک کی اقتصادی ترقی بڑی حد تک وہاں کے مزدوروں پر منحصر ہوتی ہے ۔ مزدوروں کی تعداد اور ان کی لیاقت اور ہنر مندی پر ہی مختلف ترقیاتی پروگراموں کی کامیابی کا بیشتر دار و مدار ہوتا ہے ۔ کسی ملک میں مزدوروں کی تعداد وہاں کی آبادی ، اضافۂ آبادی ، آبادی کی ساخت اور دوسری آبادیاتی خصوصیات سے متعین ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں آبادی کی ساخت اس معاملے میں سازگار نہیں ہے ۔ کم عمر افراد کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے کمانے والے طبقے پر بارِ کفالت بہت زیادہ ہے ۔ بچوں کے مقابلے میں نوجوانوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ مزدور طبقے میں اضافے کی رفتار نسبتاً سست رہی ہے ، حالانکہ کل آبادی میں اضافے کی رفتار خاصی تیز ہے ۔ کم عمر بچوں کی کثرت سے ایک عورت کی اقتصادی کارکردگی میں کمی آتی ہے ۔ تاہم روزگار کے متلاشی لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ بے روزگاری کا موجودہ اور آیندہ مسئلہ تو قابل غور ہے ہی ، اس کے علاوہ ایک امر یہ بھی ہے کہ سستے اور کثیر تعداد میں موجود مزدور زراعت اور صنعت دونوں میں بہتر تکنیکی کے اپنائے جانے میں مانع ثابت ہوتے ہیں ۔ اسی لیے ہندوستان میں فی کس پیداوار بہت کم ہے ۔ کم مزدوری کا مطلب یہ ہے کہ افراد کی قوت خرید کم ہے ، یعنی اشیا کا صرفہ کم ہوتا ہے اور زندگی کا معیار پست رہتا ہے ۔ مزدوروں کی ہنر مندی پر تعلیم و تربیت ، اور صحت و قوت جیسے محرکات اثر انداز ہوتے ہیں اور ان محرکات کی کمی کی ہندوستان کی ترقی میں ایک رکاوٹ ہے ۔ آبادی میں اضافہ بھی غریب طبقے ہی میں زیادہ ہو رہا ہے ۔ نتیجے کے طور پر سستے ، غیر ہنر مند ، نا اہل اور کم صرف مزدوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے [2]

ہندوستان کی قومی آمدنی پر مذکورہ بالا تمام حقائق کا اثر پڑتا ہے ۔ 61 - 1960 میں قومی آمدنی 132 ارب 79 کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر 73 - 1972 میں 191 ارب 1 کروڑ ہو گئی تھی ، یعنی 43.8 فی صدی کا اضافہ ہوا تھا ۔ لیکن اسی مدت میں فی کس قومی آمدنی 306 روپوں سے بڑھ کر 337.5 روپے ہوئی تھی ، یعنی صرف 10.3 فی صدی کا اضافہ ہوا تھا ۔ چنانچہ ہندوستان کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جن کی فی کس آمدنی سب سے کم ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس

ملک میں پچھلے بیس سالوں میں قومی آمدنی میں بہت ہی کم اضافہ ہوا ہے ۔

ملک کی آبادی میں ہر سال 1 کروڑ 50 لاکھ افراد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے ۔ اس بڑھتی آبادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال 1,45,900 اسکولوں، 3,99,000 استادوں، 68 لاکھ مکانوں، 21 کروڑ 69 لاکھ میٹر کپڑوں، 1448 ٹن خوردنی اناج اور 46 لاکھ روزگاروں کا مزید اضافہ ہونا چاہیے ۔ لہٰذا مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ موجودہ کمی کو کیوں کر پورا کیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا کیا انتظام کیا جائے ۔ ترقیاتی پروگرام اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب بڑھتی ہوئی آبادی اور اس سے پیدا ہونے والی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو کم کیا جائے ۔ چنانچہ ضروری ہے کہ آبادی کی مناسب منصوبہ بند حدود میں لانے کی پوری کوشش کی جائے ۔

حوالے

(1) اقوام متحدہ، "اسٹے ٹسٹیکل ایر بک 1964" نیویارک، 1965، گوشوارہ نمبر 137 ۔

(2) ایس، چندر شیکھر، "انفینٹ مارٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا"، لندن، 1972، ص 259 ۔

باب 11

آبادی کے مسائل کا حل

جیسا کہ پچھلے باب میں کہا جا چکا ہے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ یہاں ہر سال تقریباً ½1 کروڑ افراد کا اور ان کی ضرورتوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چونکہ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیداوار کو خاطر خواہ حد تک بڑھانا تقریباً ناممکن ہے، اس لیے اس مسئلے کا حل یہی معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کو بڑھنے سے روکا جائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آبادی کی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ دوسرے امور میں بھی منصوبہ بندی کی سخت ضرورت ہے۔ زراعت کی ہر ممکن طور پر ترقی، چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی صنعتوں میں اضافہ اور آبادی کے علاقائی دباؤ کو کم کرنے کے لیے اندرونی اور بیرونی مہاجرت وغیرہ کارگر اقدام ہو سکتے ہیں 1 لیکن سب سے اہم اور موثر طریقہ جس سے آبادی کے مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے ضبط تولید ہے۔

آج کل دنیا کے تقریباً تمام ممالک نے اضافۂ آبادی کے مسئلے پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بھی اس مسئلے پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ ان ملکوں کی موجودہ 3 ارب آبادی میں سے تقریباً 60 فی صد کا ایسے ملکوں میں رہتی ہے جو آبادی محدود کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں 2 ان ملکوں میں خاندانی منصوبہ بندی کو قومی پالیسی کی حیثیت اور حکومت کی حمایت اور مدد حاصل ہے۔ تاہم یہ مہم پیچیدہ ہے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے بہت سے امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لازم ہے کہ عوام کو خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں، ان میں خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں سوجھ بوجھ پیدا کی جائے اور انہیں عملی طور پر اس پالیسی کا حامی بنایا جائے 3

خاندانی منصوبہ بندی — دنیا میں ہندوستان وہ پہلا ملک ہے جس نے 1951 میں خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں ایک سرکاری پالیسی کی تشکیل کی۔ [illegible] ملک کے

گوشے گوشے میں لوگ اس سرخ تکون سے واقف ہیں جو کہ خاندانی منصوبہ بندی کا نشان ہے۔ اس ہم اصلاح تکون کی راس نیچے کی طرف ہوتی ہے جو کہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ پیدائش کی شرح کم کی جائے۔ موجودہ آماج کے مطابق 1969 کی 39 فی ہزار شرح پیدائش کو گھٹا کر پانچویں پنج سالہ منصوبے کے آخر تک 30 فی ہزار تک لانا ہے۔

ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی کی مہم دراصل 1951 سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی۔ موجودہ صدی کے شروع میں بہت سے مفکرین، مدبرین اور رضا کارانہ تنظیموں نے حکومت کو آبادی پر پابندی لگانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت اس مہم کا بنیادی مقصد ماؤں کی صحت کی حفاظت کرنا تھا۔ 1925 میں پروفیسر رگھوناتھ دھونڈو کاروے نے ہندوستان میں سب سے پہلا فیملی پلاننگ شفاخانہ کھولا تھا۔ میسور (موجودہ کرناٹک) میں سرکاری طور پر اس طرح کا شفاخانہ 1930 میں کھولا گیا تھا۔ حکومت مدراس (موجودہ تامل ناڈ) نے بھی ایک شفاخانہ 1932 میں کھولا تھا۔ اسی سال کل ہند خواتین کانفرنس کا ایک اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا جس میں ایک قرارداد میں کہا گیا تھا کہ منظور شدہ شفاخانوں میں مردوں اور عورتوں کو ضبط تولید کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے انتظامات کیے جائیں۔ قومی پلاننگ کمیٹی نے، جو کہ انڈین نیشنل کانگریس کی قائم کردہ تھی اور جس کے چیرمین جواہر لال نہرو تھے، خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کی تھی۔ 1936 میں ڈاکٹر اے، اے، پلائی نے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ایک نصاب ترتیب دیا تھا، اور 1940 میں پی، این، سپرو کی کوششوں سے ایک قرارداد کاؤنسل آف اسٹیٹس میں پیش کی تھی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ ملک میں ضبط تولید کے شفاخانے قائم کیے جائیں۔ حکومت ہند نے 1943 میں ہیلتھ سروے اینڈ ڈیولپمنٹ کمیٹی قائم کی تھی جس کے صدر سر جوزیف بھور تھے۔ اس کمیٹی نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی کہ سرکاری ہسپتالوں میں ضبط تولید کے شعبے کھولے جائیں تاکہ ماؤں کی صحت کی حفاظت کی جا سکے۔ 1949 میں بمبئی میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ایک ایسوسی ایشن قائم کی گئی تھی جس کا مقصد خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو مقبول بنانا تھا۔

ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی کو سرکاری پروگرام کی حیثیت سے 1952 میں تسلیم کیا گیا۔ لیکن پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں (61 - 1951) کے دوران زیادہ تر زور تحقیقی پروگراموں پر اور طبی خدمات فراہم کرنے کے لیے مرکزی اور صوبائی تنظیموں کے قیام

پر دیا گیا۔ تحقیقات بہت سے میدانوں میں کی گئی مثلاً ضبط تولید کے سلسلے میں عوام کی آمادگی ان کے لیے معلومات کی فراہمی کی گنجائش، عمرانیاتی امکانات اور افزائش نسل کے لحاظ سے جسم انسانی کا فعل۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس پروگرام کو دوبارہ منظم کیا گیا، اس لیے کہ 1961 کی مردم شماری سے ظاہر ہوا تھا کہ اضافۂ آبادی توقع سے زیادہ ہے۔ اس وقت تک خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں لوگوں کو صرف طبی سہولتیں دی جاتی تھیں لیکن 1961 کے بعد حکومت نے لوگوں کو باخبر کرنے، ان کو سرکاری خدمات پیش کرنے اور مانع حمل اشیا فراہم کرنے کا ایک توسیعی پروگرام شروع کیا۔ 1966 میں باقاعدہ طور پر فیملی پلاننگ ڈپارٹمنٹ قائم ہوا۔ شروع کے تین سالوں (69-1966) میں ایک آماج کے مطابق پروگرام کو آگے بڑھایا گیا۔ چوتھے منصوبے کے دوران خاندانی منصوبہ بندی کو فوقیت دی گئی اور یہی صورتِ حال پانچویں پنج سالہ منصوبے میں بھی ہے۔ موجودہ منصوبے کے مطابق یہ پروگرام مرکز کی نگرانی میں 84-1983 تک چلے گا۔ اب اس پروگرام میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خدمات کے ساتھ صحت، ماں اور بچے کی نگرانی اور غذائیت سے متعلق خدمات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام پر عملدرآمد کرنے کا کام صوبائی حکومتوں کا ہے لیکن اس بارے میں مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کو سو فی صدی امداد فراہم کرتی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے عام طریقے ـــ ہندوستان جیسے غریب ملک میں جہاں قسم قسم کی طرز زندگی اور مختلف رسم و رواج کے لوگ بستے ہیں، مانع حمل اشیا کا انتخاب بہت مشکل ہے۔ سرکاری شفاخانوں میں وہ تمام مانع حمل اشیا موجود رہتی ہیں جن کو سائنسی اعتبار سے کامیاب تسلیم کیا جا چکا ہے۔ پھر بھی ہندوستان میں زیادہ تر چار طریقوں سے ضبط تولید پر عمل درآمد ہوتا ہے [7]

سب سے پہلا طریقہ نس بندی ہے۔ ضبط تولید کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی ہے۔ اسے مرد بھی اختیار کر سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ ایک قسم کا جراحی عمل (آپریشن) ہوتا ہے۔ مردوں کے لیے یہ آپریشن بہت معمولی ہوتا ہے لیکن عورتوں کو آپریشن کرانے کے لیے ایک یا دو دن ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کے آپریشن ہندوستان میں سب سے پہلے 1957 میں صوبہ مدراس (موجودہ تامل ناڈو) میں کیے گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں مہاراشٹر اور کیرالا میں شروع کیا گیا۔ اب پورے ملک میں نس بندی آپریشن عام ہیں۔ شروع سے

ہی اس طرح کے آپریشن رضاکارانہ اور مفت ہوتے رہے ہیں ۔ ڈاکٹر اور ہسپتال کی فیس اور دوا کا خرچہ حکومت برداشت کرتی ہے ۔ اس کے علاوہ مریض کی کچھ مالی مدد بھی کی جاتی ہے ۔ کچھ سرکاری محکموں نے اپنے ملازمین کے لیے جو آپریشن کرانا چاہیں چھٹی اور دوسری مراعات کا انتظام کر رکھا ہے ۔ 75 - 1974 میں 13 لاکھ 28 ہزار اشخاص نے نس بندی آپریشن کرائے تھے ۔ مارچ 1975 تک اس طرح کے کل آپریشنوں کی تعداد 1 کروڑ 62 لاکھ 50 ہزار تھی ۔ اگست 1978 تک یہ تعداد 2 کروڑ 84 لاکھ 70 ہزار ہو گئی تھی ۔

ضبطِ تولید کا دوسرا اور موثر طریقہ یہ ہے کہ رحم کے اندر کسی شے سے روک لگا دی جائے ۔ ایک ایسی ہی شے (آئی، یو، سی، ڈی) یا "لوپ" ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں بہت دنوں سے استعمال کی جا رہی ہے ۔ ہندوستان میں یہ سب سے پہلے 1965 میں بڑے پیمانے پر استعمال میں لائی گئی ۔ اس بات کو لوگ بہت دنوں سے جانتے تھے کہ اگر کوئی دھات کا بنا ہوا چھلّا یا اسی طرح کی کوئی دوسری چیز رحم کے اندر لگا دی جائے تو حمل نہیں ٹھہرتا ۔ شروع میں اس طرح اشیا سونے یا کسی اور دھات کی بنائی جاتی تھیں ۔ بعد میں دریافت ہوا کہ ریشم یا نائلون کے چھوٹے چھوٹے چھلّوں سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے ۔ پلاسٹک سے بنے لوپ اور بھی زیادہ موثر ثابت ہوئے ہیں ۔ طبّی تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ لوپ کا لمبے عرصے تک بھی استعمال مضر نہیں ہوتا ۔ اس کے استعمال میں آسانی یہ ہے کہ اسے اپنی جگہ رکھ دینے کے بعد کچھ اور نہیں کرنا پڑتا اور اسے اس وقت تک نکالنے کی ضرورت نہیں ہوتی جب تک کہ بچہ پیدا کرنے کا ارادہ نہ ہو ۔ پلاسٹک کے لوپ کو ترقی پذیر ممالک کے لیے سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا ہے اس لیے کہ اسے لگانے میں کسی خاص مہارت کی ضرورت یا زحمت نہیں ہوتی ۔ ہندوستان میں 75 - 1974 کے دوران 24 لاکھ 30 ہزار جوڑوں نے اس طریقے کو اپنایا ۔ مارچ 1975 تک اس طریقے کو اپنانے والے جوڑوں کی کل تعداد 54 لاکھ 37 ہزار تھی جو اگست 1978 میں 71 لاکھ ہو گئی تھی ۔ بہر حال یہ طریقہ اتنا مقبول نہیں ہوا جتنی کہ توقع تھی ۔ اس کی خاص وجہ سرکاری پروپگنڈے کی کمی اور عوام کی بے توجہی ہے ۔ یہ تو ہے کہ لوپ استعمال کرنے والی عورتوں میں سے چند کو جریان خون کی شکایت ہو جاتی ہے یا کچھ کو ایک قسم کی جسمانی غیر آسودگی محسوس ہوتی ہے مگر زیادہ تر کے لیے یہ ایک بے ضرر چیز ہے [9] اس سلسلے میں مزید تحقیقی مطالعے کیے جا رہے ہیں ۔ بہر حال ہندوستان میں موجودہ ضرورت کے مطابق لوپ بنائے جانے

لگے ہیں۔

تیسرا طریقہ کانڈوم یا نرودھ کا استعمال ہے ۔ یہ ایک عمدہ قسم کی ربر کا جھلی نما غلاف ہوتا ہے ۔ تری وینڈرم میں قائم ہندوستان لیٹیکس لیمیٹیڈ 1966 سے نرودھ بنا رہا ہے ۔ ہندوستان میں نرودھ کی کھپت 69 - 1968 میں ۱ کروڑ 57 لاکھ سے بڑھ کر 75 - 1974 میں 6 کروڑ 40 لاکھ اور 78 - 1977 میں ۱۰ کروڑ 96 لاکھ ہوگئی تھی ۔ شروع میں مانگ کو پورا کرنے کے لیے درآمد بھی کرنی پڑتی تھی، لیکن اب زیادہ تر مانگ ہندوستانی کارخانے پوری کردیتے ہیں ۔ نرودھ کی فروخت اور ملک کے دور افتادہ دیہی علاقوں میں اس کی تقسیم کے لیے سرکاری اور نیم سرکاری تنظیموں اور محکموں کی مدد لی گئی ہے ۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ طریقہ سب سے زیادہ عام اور مقبول ہے ۔

60 - 1950 کے دوران دنیا کے مختلف حصوں میں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عورت کی بچہ دانی میں بیضے کی تشکیل کو روکا جاسکتا ہے ۔ یہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ان اندرونی افراز (ہارمون) پر قابو پالیا جائے جو عورتوں کے جسم میں کیمیاوی توازن کو برقرار رکھتے ہیں ۔ ہارمون پر قابو پانے کے لیے ضبطِ تولید کی گولی (پل) یا انجکشن استعمال کیے جاسکتے ہیں ۔ زیادہ تر استعمال " پلز " کا ہوتا ہے ۔ ماہواری ختم ہونے کے فوراً بعد سے عورت کو روزانہ ایک پل 20 یا 21 دن تک کھانی ہوتی ہے ۔ اس کے بعد حیض کے دوران میں سات یا آٹھ دن یہ سلسلہ منقطع کر دینا ہوتا ہے ۔ یہ سلسلہ ہر ماہ دہرایا جاتا ہے ۔ یہ طریقہ سو فی صدی کامیاب ہے بشرطیکہ صحیح طور پر معمول کی پابندی کی جائے ۔ کچھ عورتوں کی شروع شروع میں طبیعت مالش کرتی ہے چکر آتے ہیں یا معمول کے خلاف حیض جاری ہوجاتا ہے لیکن یہ شکایات بہت جلد رفع ہوجاتی ہیں ۔

ہندوستان میں وزارتِ صحت اور خاندانی منصوبہ بندی شعبے نے 1968 تک اس طریقے کی حمایت نہیں کی تھی کیونکہ یہ طریقہ درآمدات پر منحصر ہونے کی وجہ سے بہت مہنگا تھا ۔ 1968 میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی امداد کے ذریعے ایک تجرباتی پروگرام شروع ہوا جس میں تقریباً ایک لاکھ عورتوں پر تجربہ کرنے کا منصوبہ تھا ۔ لیکن تربیت یافتہ اشخاص کی کمی کی وجہ سے صرف 50 ہزار شہری عورتوں پر تجربہ کیا جاسکا ۔ بہرحال اس طریقے کا بھی استعمال ہورہا ہے ۔ مارچ 1975 تک کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں 18726 عورتوں نے یہ طریقہ

اپنا لیا تھا ۔ خاندانی منصوبہ بندی شعبہ کا دعویٰ ہے کہ مارچ 1978 تک اس طریقہ سے تقریباً 3 کروڑ 53 لاکھ ولادتوں کو روکا جاسکا ہے ۔

مذکورہ بالا چار طریقوں کے علاوہ ایک طریقہ اسقاطِ حمل ہے جو کہ آخری چارہ ہے ۔ جاپان اور بہت سے مغربی یورپ کے ملکوں نے اسقاطِ حمل کو بہت پہلے جائز قرار دے دیا تھا ۔ اس کا وہاں کی شرح پیدائش پر خاصا اثر پڑا تھا ۔ ہندوستان میں اس کی قانونی منظوری یکم اپریل 1972 کو دی گئی ۔ قانون کی رو سے رجسٹر شدہ ڈاکٹروں کے ذریعے منظور شدہ ہسپتالوں میں حمل ضائع کرانے کی اجازت ہے ۔ پورے ہندوستان میں اس طرح کے منظور شدہ ہسپتال ایک ہزار سے زیادہ ہیں ۔ مارچ 1975 تک صرف ایک لاکھ 64 ہزار عورتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا لیکن اگست 1978 تک یہ تعداد بڑھ کر 18 لاکھ ہوگئی تھی ۔

خاندانی منصوبہ بندی کے دوسرے طریقے ـــــ بروقت استعمال کیے جانے والے روایتی طریقوں میں ڈائفرام ، جیلی اور فوم ٹیبلٹ ہیں ، جن کا استعمال ہندوستان میں ہوتا رہا ہے ۔ لیکن یہ طریقے زیادہ مقبول نہیں ہوئے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ دوسرے موثر اور سہل طریقے دریافت ہوچکے ہیں جن میں سے چند کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے ۔

ان سب کے علاوہ ایک موثر طریقہ جس میں کسی دوا یا شے کی بھی ضرورت نہیں ہے یہ ہے کہ عورت کے "بارآور" دنوں میں جماع سے احتراز کیا جائے ۔ اسے "لحاظ وقت کا طریقہ" (Rhythm method) کہتے ہیں ۔ اگرچہ ہندوستان میں اس طریقے کو بہت کم مقبولیت حاصل ہے تاہم یورپ اور امریکہ کی شرح پیدائش میں کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ بارآور دنوں سے واقفیت اور ان کا حساب رکھتے ہیں ۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر ترقی پذیر ملکوں میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا مثبت اثر ہوگا [9]

خاندانی منصوبہ بندی میں لحاظ وقت کا طریقہ نیا نہیں ہے ۔ 1930 کی دہائی تک طبی ماہرین کا خیال تھا کہ حیض جاری ہونے کے 5 دن پہلے سے 8 دن بعد تک احتیاط برتنی چاہیے ۔ لیکن اس کے بعد جسم انسانی کے بارے میں مزید تحقیقات سے بالکل صحیح اوقات کا اندازہ لگا لیا گیا ہے ۔ پتہ چلا ہے کہ حیض کے چند روز بعد کم سے کم چار دن کا ایک ایسا دور آتا ہے جس میں حمل قرار پانے کے امکانات بہت قوی ہوتے ہیں ۔ لہٰذا اس دوران میں احتیاط برتنے سے حمل روکا جاسکتا ہے ۔ جن عورتوں کی ماہواری معمول کے مطابق ، یعنی صحیح وقت

پر، ہوتی ہے ان کے "بارآور" (یا خاندانی منصوبہ بندی کے نظریہ سے "غیر محفوظ") دنوں کا معلوم کرنا بہت سہل ہے۔ سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اگلی مرتبہ حیض کس دن جاری ہوگا۔ اگر حیض میں باقاعدگی ہے تو یہ دن آسانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس دن سے 18 دن پہلے "غیر محفوظ" دنوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور 11 دن پہلے تک رہتا ہے۔ ان آٹھ دنوں میں احتیاط کے طور پر تین دن اور شامل کر دیے گئے ہیں۔ ویسے حیض سے 12 سے 16 دن قبل کا دور یقیناً غیر محفوظ ہوتا ہے۔

جن عورتوں کا حیض معمول کے مطابق نہیں ہوتا ان کے لیے "غیر محفوظ" دن معلوم کرنے کا طریقہ دوسرا ہے۔ سب سے پہلے تو کم سے کم پچھلی چھ ماہواریوں کے مطابق یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دو ماہواریوں کے درمیان "کم سے کم" اور "زیادہ سے زیادہ" کتنا وقفہ رہا ہے۔ "کم سے کم" دنوں میں سے 18 اور "زیادہ سے زیادہ" دنوں میں سے 11 کی تفریق سے جو اعداد حاصل ہوتے ہیں ان کو آیندہ ماہواری کے ممکن دن سے پہلے شمار کرنا چاہیے۔ اس طرح جو مدت معلوم ہوگی وہی "غیر محفوظ" دنوں کی مدت ہے۔

یہ بھی معلوم کیا گیا ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے والے جوڑوں میں سے 25 فی صدی کامیاب نہیں ہوتے۔ طبی ماہرین اس کی بہت سی وجہیں بتاتے ہیں جن میں دو اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ جنسی جوش کی وجہ سے عورت کی بچہ دانی میں بیضہ آوری معینہ مدت کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے، کبھی کبھی یہ ممکن ہے کہ مادۂ تولید رحم کے لعابی مادے کے ساتھ کچھ وقت کے لیے وہاں رہ جائے اور بیضہ آوری کے بعد حمل کا باعث ہو جائے۔ اس طرح عورت کے محفوظ دن بھی ہمیشہ محفوظ نہیں ہوتے، لیکن اس طریقے سے اتنا یقینی ہے کہ قرار حمل کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں "لحاظ وقت" کا طریقہ رائج کرنے کی کوشش بہت دنوں سے جاری ہے لیکن دیہی علاقوں میں لوگوں کی لاعلمی کے باعث بہت کم کامیاب ہوا ہے [12]۔ واقعہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی محفوظ اور غیر محفوظ دنوں کا حساب رکھنے میں کچھ زیادہ ہوشمند نہیں رہتے۔

حکومتِ ہند کی آبادی سے متعلق قومی پالیسی (اپریل 1976) ـــ پانچویں پنج سالہ منصوبے میں خاندانی منصوبہ بندی کے ساتھ صحت اور غذائیت کے پروگراموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پورے منصوبے کا مقصد یہ ہے کہ پیدائش کی شرح کو 39 فی ہزار (1969) سے گھٹا کر موجودہ منصوبے کے آخر (1979) تک 30 فی ہزار اور 84-1983 تک 25 فی ہزار

کر دیا جائے ۔ اس سلسلے میں طے کیا گیا کہ جوان جوڑوں کو افزائش نسل سے باز رکھنے کی ہر طرح ترغیب دی جائے لیا بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لیے صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی وزارت نے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ سے مشورہ کرکے اپریل 1976 میں آبادی سے متعلق ایک نئی قومی پالیسی کا اعلان کیا تھا جس میں آگاہ کیا گیا تھا کہ اگر ملک کی سلامتی اور اقتصادی خوش حالی درکار ہے تو آبادی کے مسئلے کو ملک کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھنا چاہیے اور اس کے حل کے لیے مجوزہ اقدام اٹھانے ہوں گے ۔

اس ضمن میں جو قدم سب سے اہم گردانا گیا ہے یہ ہے کہ کم عمری کی شادی روکی جائیں ۔ شادی کے وقت کم سے کم عمر لڑکیوں کے لیے 15 سال کے بجائے 18 سال اور لڑکوں کے لیے 18 سال کے بجائے 21 سال کردی جائے ۔ اس تجویز کی عملی کامیابی کے لیے شادیوں کے لازمی سرکاری اندراج کا معاملہ زیر غور ہے ۔ شادی شدہ جوڑوں کی عمر میں زیادہ پختگی ہوگی تو وہ زیادہ سوجھ بوجھ سے کام لیں گے ۔ بچے کی اچھی پرورش کے ساتھ ساتھ ماں کی صحت بھی برقرار رہے گی ۔ کم عمر عورت بچہ جنتی ہے تو زچہ بچہ دونوں کی موت کا امکان زیادہ ہوتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اگر عورتوں کو اقتصادی، سماجی اور دیگر تعمیری کاموں میں ان کا مناسب حصہ ملنا چاہیے تو ان پر زچگی اور خصوصاً کم عمری میں زچگی کا بار کم کرنا چاہیے ۔

اگرچہ مذکورہ بالا پالیسی مرکزی حکومت کی قومی پالیسی تھی تاہم اس کے نفاذ کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ڈال دی گئی تھی ۔ صوبائی حکومتوں سے توقع کی گئی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں اس پالیسی پر زیادہ سے زیادہ موثر طور سے عمل درآمد کرنے کی کوشش کریں گی ۔ اس سلسلے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی صوبائی حکومت آبادی کی قومی پالیسی پر عمل کرتی ہے اور اپنی آبادی کی روک تھام کرتی ہے تو آبادی کم ہونے سے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پارلیمنٹ میں اس کی نشستیں کم ہو جائیں گی ۔ چنانچہ تجویز ہے کہ لوک سبھا اور ریاستی قانون ساز اسمبلی میں نمائندگی کو 1971 کی مردم شماری کے لحاظ سے 2001 تک کے لیے منجمد کر دیا جائے ۔ اس طرح جو ریاستیں خاندانی منصوبہ بندی پر کاربند نہیں ہیں یا کم مستعد ہیں ان میں اضافۂ آبادی کے باعث نمائندگان کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوگا ۔ دوسرے الفاظ میں 1981 اور 1991 کی مردم شماری کے لحاظ سے لوک سبھا اور ریاستی قانون ساز اسمبلی میں سیٹوں کو کم یا زیادہ نہیں کیا جائے گا ۔

مختلف تحقیقات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کا جہالت سے براہ راست

تعلق ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے یہاں بچے بھی نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا تجویز پیش کی گئی ہے کہ تعلیم نسواں کو فروغ دیا جائے تاکہ بچوں کی پیدائش کم ہو۔ جوان اور زیادہ عمر کی عورتوں کے لیے تعلیمی منصوبہ ان پسماندہ علاقوں کے لیے خاص طور پر اہم ہے جہاں تعلیم کی کمی کے ساتھ ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کا بھی کم کام ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اضافۂ آبادی کا مسئلہ پختہ سن لوگوں کے مقابلے میں نئی نسل کے لوگوں کے لیے زیادہ اہم ہے اور ان کو اس بارے میں پورے طور پر آگاہ کرنا ضروری ہے۔ وزارت تعلیم نے آبادی کا مسئلہ ذہن نشین کرنے کے لیے بچوں کی بہت سی درسی کتابیں شائع کی ہیں تاکہ وہ شروع سے ہی باخبر ہو جائیں۔ اصل میں آبادی کے مسئلے کا حل کسی ایک فرد یا شعبے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ہر فرد اور ہر شعبے کی کوششیں درکار ہیں۔ اس لیے پالیسی کے طور پر طے کیا گیا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا کام طبی اداروں، ضلع اور پنچایت سمیتوں، مختلف سطح کے تعلیمی اداروں اور دیگر تنظیموں کے سپرد کیا جائے گا، اور ان کو مناسب ترغیب دی جائے گی۔ منصوبہ بندی کا کام رضا کارانہ طور پر کیا جائے گا لیکن یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو گا جب تک عوام اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بہت سے طریقے معلوم ہیں لیکن مزید بہتر طریقوں کی تلاش جاری ہے۔ جب تک کہ کوئی اور موثر طریقہ دریافت نہ ہو نس بندی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ مرکزی حکومت کے ریاستوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ نس بندی کو لازمی کر سکتی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کا انداز فکر بدلا جائے تاکہ وہ اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کے خطرات پر نظر رکھیں۔ ملک کے دور افتادہ دیہی علاقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام پہنچانا بے حد ضروری ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ " ہمیں لوگوں (کی اقتصادی زندگی) کی فکر کرنی چاہیے، آبادی اپنی فکر اپنے آپ کر لے گی۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کو آبادی کی تعداد کی فکر کرنے کے بجائے عوام کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ آبادی جتنی خوش حال ہو گی اس میں اتنا ہی اپنے آپ کو بہتر بنانے کا جذبہ پیدا ہو گا۔ بہرکیف آبادی کو محدود کرنے کے لیے ایک شعوری کوشش ضروری ہے۔

مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کا ہے، جس کے بہت سے طریقے ہیں۔ لیکن یہ

تمام طریقے ہر جگہ یکساں طور پر نہیں اپنائے جا سکتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ کی آبادی مختلف سماجی، اقتصادی اور سیاسی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے ۔ آبادی کا مسئلہ ہر جگہ ایک سا نہیں ہے اور آبادی کے مسئلہ کی شدت کا احساس بھی ہر جگہ ایک سا نہیں ہے بہر حال، چونکہ آبادی پر قابو پانے کا مسئلہ عوام کا ذاتی مسئلہ ہے اس لیے عوام کو اس کا پوری طرح احساس ہونا چاہیے اور اگر احساس نہیں ہے تو حکومت یا انتظامیہ کو اس سلسلے میں اقدام کرنے چاہئیں ۔

اگر عوام کو مسئلہ کا پوری طرح احساس ہو بھی جائے تو بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ افزائش نسل پر پابندی لگانے کی کوشش کریں، کیوں کہ اس معاملے میں سماجی محرکات سے زیادہ اقتصادی محرکات کا زور چلتا ہے ۔ فرانس کے ایک ماہر عمرانیات، ' دیوانٹ'، کا مفروضہ ہے کہ سماج میں صرف وہی طبقہ افزائش نسل پر از خود پابندی عائد کرے گا جو خوش حال ہے اور جسے اپنی املاک کا ٹکڑوں میں بٹنے کا خطرہ ہے ۔ اس طبقے کو اگر اپنی اور اپنی اولاد کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا احساس ہوگا تو وہ ہمیشہ اولاد کی تعداد کے بارے میں سوچے گا جس پر اس کی املاک تقسیم ہوگی ۔ لیکن جو طبقہ خوش حال نہیں ہے اور جس کے پاس کسی قسم کا اثاثہ یا جائداد نہیں ہے اس کا طرز فکر مختلف ہوگا ۔ وہ طبقہ ریاضی کے اس اصول کے مطابق سوچے گا کہ اگر صفر کو کسی بھی بڑے سے بڑے یا چھوٹے سے چھوٹے عدد سے تقسیم کیا جائے تو نتیجہ صفر ہی ہوگا ۔ اگر کسی طبقے کے پاس املاک ہی نہیں ہے تو اس کے بٹنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ؟ اس طبقے کو اگر کچھ اقتصادی بہتری نظر آئے گی تو اس امر میں کہ اس کی اولاد کی تعداد زیادہ ہو اور وہ کوئی بھی پیشہ کر کے اپنے والدین کے لیے روزی مہیا کرے ۔ بد قسمتی سے ہندوستان کے غریب طبقے میں صورت حال یہی ہے ۔

اگر سماجی اور اقتصادی حالات کو نظر انداز کر کے لوگوں کو ضبط تولید کے طریقوں کو اپنانے پر مجبور کیا جائے تو یہ نہ صرف ناجائز بات ہوگی بلکہ اس کا افراد کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑ سکتا ہے ۔ حالانکہ آبادی کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا ہے اور صرف قومی ہی نہیں بلکہ عالمی مسئلہ بن چکا ہے، تاہم اولاً اور آخراً یہ افراد کا ذاتی مسئلہ ہے اور اس میں جبر کیا جائے تو وہ عوام کو حکومت یا تنظیم کے خلاف بغاوت پر اکسا سکتا ہے ۔ لہٰذا صحیح طریقہ یہی ہے کہ حکومت ہر طور پر عوام کو آگاہ اور آمادہ کرے اور ساتھ ہی ساتھ غریب طبقے کو اقتصادی اعتبار سے خوش حال بنانے کی کوشش کرے تاکہ وہ از خود آبادی کی تعداد کو محدود کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوں ۔

حوالے

(1) ایس، چندرشیکر، " انڈیاز پاپولیشن "، میرٹھ، 1967، PP 30-35 -

(2) ایس، این، اگروالا، " انڈیاز پاپولیشن پرابلمز "، نئی دہلی، 1974، P 157 -

(3) ڈی، جے، بوگ، " پرنسپلز آف ڈیموگرافی "، نیویارک، 1969، PP 624-627

(4) سابقہ حوالہ ۲، P 158 -

(5) کے، ٹی، شاہ (مولف)، " پاپولیشن "، بمبئی، 1937، P 174 -

(6) حکومت ہند، " ہیلتھ سروے اینڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ "، جلد دوم، نئی دہلی، 1946، P 487 -

(7) ایس، چندرشیکر، " انفینٹ مارٹیلٹی، پاپولیشن گروتھ اینڈ فیملی پلاننگ ان انڈیا "، لندن، 1972، PP 272-75 -

(8) سابقہ حوالہ ۷، P 273 -

(9) سابقہ حوالہ ۳، P 838 -

(10) سابقہ حوالہ ۱، PP 37-40 -

(11) پلاننگ کمیشن، حکومت ہند، " ڈرافٹ ففتھ فائیو ایر پلان 79 - 1974 "، جلد دوم، PP 240 اور 241 -

اصطلاحات

آبادی	POPULATION
آبادی کا گھنا پن (گنجان پن)	DENSITY OF POPULATION
آبادیاتی نظریات	POPULATION THEORIES
آبیاری	IRRIGATION
آبنائے	STRAIT
اثریات	ARCHAEOLOGY
ازدواجی درجہ (درجات)	MARITAL STATUS
اسقاط حمل	ABORTION/MEDICAL TERMINATION OF PREGNENCY
اضافۂ آبادی	POPULATION GROWTH
اعداد و شمار	DATA
افزائشِ نسل	REPRODUCTION
افزائش نسل کی صلاحیت	FERTILITY
اقتصادیات (معاشیات)	ECONOMICS
آمار	STATISTICS
امکانی زندگی	LIFE EXPECTANCY
امکانی طول زندگی	LONGEVITY
اندرونی مہاجرت	INTERNAL MIGRATION
انسانیات	ANTHROPOLOGY
بار آور	REPRODUCTIVE
بار کفالت	BURDEN OF DEPENDENCY
باصلاحیت (افزائش نسل کے اعتبار سے)	FERTILE

CONTINENT	براعظم
SUB-CONTINENT	برصغیر
UN-EMPLOYMENT	بے روزگاری
EXTERNAL MIGRATION	بیرونی مہاجرت
MAXIMUM POPULATION	بیشترین آبادی
DEVELOPING	ترقی پذیر
DEVELOPED	ترقی یافتہ
POPULATION DISTRIBUTION	تقسیم آبادی
RATIO/PROPORTION	تناسب
PENINSULA	جزیرہ نما
SEX RATIO	جنسی تناسب
SEX STRUCTURE	جنسی ساخت
YOUNG POPULATION	جوان آبادی
SPARSE POPULATION	چھدری آبادی
LITERATE	حروف شناس (تعلیم یافتہ)
LITERACY	حروف شناسی
OUT-MIGRATION	خارجی مہاجرت
CRUDE RATE	خام شرح
FAMILY PLANNING	خاندانی منصوبہ بندی
FAMILY WELFARE	خاندانی فلاح و بہبود
TROPIC OF CAPRICORN	خطِ جدی
TROPIC OF CANCER	خط سرطان
REGION	خطّہ
BAY/GULF	خلیج
IN-MIGRATION	داخلی مہاجرت

English	Urdu
SCHEDULED CASTE	درج فہرست ذات
SCHEDULED TRIBE	درج فہرست قبیلہ
RENAISSANCE	دورِ احیا
MATHEMATICS	ریاضیات
OVER-POPULATION	زائد آبادی
ARITHMETIC PROGRESSION	سلسلۂ ریاضی
GEOMETRIC PROGRESSION	سلسلۂ ہندسیہ
SOCIOLOGY	سماجیات
SOCIAL CAPILLARITY	سماجی شعریت
RATE	شرح
RATE OF POPULATION GROWTH	شرح اضافۂ آبادی
DEATH RATE	شرح اموات
BIRTH RATE	شرح پیدائش
NUMERATOR	شمار کنندہ
INFANT	شیر خوار
BIRTH CONTROL	ضبطِ تولید
PHYSICAL NATURAL FACTORS	طبعی محرکات
PHYSICS	طبیعات
INFANT MORTALITY	طفلی اموات
LONGITUDE	طولِ بلد
LATITUDE	عرضِ بلد
PHYSIOLOGY	عضویات
DEMOGRAPHY	عمرانیات
DEMOGRAPHIC STRUCTURE	عمرانیاتی ساخت
AGE STRUCTURE COMPOSITION	عمری ساخت

NUTRITION	غذائیت
NATURAL INCREASE	فطری اضافہ
ECONOMICALLY ACTIVE	فعال (اقتصادی اعتبار سے)
UNDER-POPULATION	کم آبادی
MINIMUM POPULATION	کم ترین آبادی
UNDER EMPLOYMENT	کم روزگاری
DENSE POPULATION	گنجان آبادی
DENSE POPULATION	گھنی آبادی
RHYTHM METHOD	لحاظِ وقت (طریقہ)
POSITIVE GROWTH	مثبت اضافہ
CENSUS/ENUMERATION	مردم شماری
CULTIVATED	مزروعہ
POPULATION PROBLEMS	مسائلِ آبادی
OPTIMUM POPULATION	مناسب ترین آبادی
ZONE	منطقہ
NEGATIVE GROWTH	منفی اضافہ
NEGATIVE AREAS	منفی علاقے (خطے)
MIGRATION	مہاجرت
L-NUTRITION	ناقص غذائیت
STERILISATION	نس بندی
DENOMINATOR	نسب نما
RENAISSANCE	نشاتِ ثانیہ
REGISTRATION SYSTEM	نظامِ اندراج
MID-YEAR POPULATION	وسط سال کی آبادی